آتے دِنوں میں گم

نظمیں

زاہد منیر عامر

آتے دِنوں میں گُم

نظمیں

زاہد منیر عامر

ضابطہ

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں

2021

نام کتاب : آتے دنوں میں گم (نظمیں)

شاعر : پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر ڈائریکٹر ادارۂ زبان و ادبیات اردو، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

بہ اہتمام : علامہ عبدالستار عاصم، محمد فاروق چوہان

قانونی مشیر: رانا شہناز احمد خان ایڈووکیٹ

ناشر : قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بنک سٹاپ، والٹن روڈ لاہور کینٹ

فون : 03000515101

ای میل : qalamfoundation3@gmail.com

آتے دِنوں میں گُم

نظمیں

زاہد منیر عامر

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل ○ لاہور

آتے دنوں کے نام

فہرس

۳

اختتامیہ:

پیش سخن

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی غیر معمولی علمی و ادبی صلاحیتیں اُس زمانے ہی سے خراجِ تحسین وصول کرتی چلی آ رہی ہیں جب اُنھوں نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اپنی پہلی کتاب لکھ کر اکابر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ بعد ازاں اُن کے زرخیز قلم نے مضامینِ نو کے انبار لگا دیے جن میں مضامین، مقالات اور کالموں کے علاوہ چالیس پینتالیس چھوٹی بڑی کتابیں بھی شامل ہیں۔ تصانیف کی اسی طویل فہرست میں تین شعری مجموعوں کے نام بھی آتے ہیں جن میں یہ تازہ مجموعہ ''آتے دنوں میں گُم'' ایک کا اضافہ کرتا ہے۔

شاعری میں زاہد منیر صاحب کا غالب رجحان آزاد نظم کی طرف ہے اور گزشتہ ایک عشرے میں اُن کی ارتقا پاتی ہوئی نظم اُس سطح پر آ گئی ہے جہاں وہ معاصر نظم کے قابلِ لحاظ شعراء میں شمار کیے جانے کا استحقاق پیدا کر چکے ہیں۔ اُن کا یہ تازہ مجموعہ صرف نظموں ہی پر مشتمل ہے جن میں عُمق، گہرائی اور تخلیقیت کے عناصر روز افزوں نظر آتے ہیں۔ اُن کے مصرعے، بسا اوقات، اس قدر سادہ و برجستہ ہوتے ہیں کہ اُن کی نثر نہیں بنائی جا سکتی مگر اُن

کا تخلیقی وفور اور پُر معنی ایمائیت قاری کو بزور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے:

''مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے''

''اِدھر مغرب میں مشرق کا مسافر دن ڈھلے پہنچا''

''مجھے جلدی بہت تھی اس لیے جملے بھٹکتے تھے''

''حقیقت واہمہ ہے''

''تماشا رنگ پر تھا اور مژہ برہم نہ ہوتی تھی''

''پرندوں کے پر اپنی ڈوری سے باندھو''

ایک طرح کا غُموض (Obscurity) جو تفصیلات حذف کرنے سے پیدا ہوتا ہے، اچھی نظم کی جان ہے۔ زاہد منیر کو اس غموض کی اہمیت معلوم ہے۔ چنانچہ ہر چند کہ اُن کا ذہن کسی ابہام کا شکار نہیں، اُن کا مسلک یہ ہے کہ فنی تصویریں بہت دو ٹوک نہیں ہونی چاہئیں۔ اُن کی نظموں کے عنوانات اکثر اپنے موضوع کی تحدید نہیں کرتے اور وہ تخلیقی لمحے کے پگھلتے ہوئے سورج کو دُھند کا ایک فرغل پہنا دینا پسند کرتے ہیں۔

یہ پہلو دار نظمیں ہمیں جا بجا، اُس تحیّر سے دو چار کرتی ہیں جس کی گرفت میں آ کر ہم داد دینا تک بھول جاتے ہیں۔ ان نظموں کا کمایا ہوا بدن اسی طرح آس پاس پھیلی زندگی سے اپنا وجود کشید کرتا ہے جیسے انھوں نے نظم ''ایکویریم'' میں خود بیان کیا ہے۔

''میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا''

اور جب نظم کا بدن بن رہا ہوتا ہے تو زبان بھی تخلیق کے شعلے سے پگھل کر از سرِ نو تشکیل پانے لگتی ہے اور بسا اوقات ایک فرسودہ (Cliche) مفہوم سے نکل کر کسی نئی جہت میں جست بھرتی ہے، مثلاً اسی نظم میں:

''مرے سامنے وسعتیں بے کراں ہیں

مگر بے کرانی ہے حدِ نظر تک"

"حدِ نظر" کا متعین مفہوم وسعت اور پھیلاؤ کا تاثر دیتا ہے، مگر یہاں کسی کوشش کے بغیر لفظ "حد" سمٹ کر محدودیت کی علامت بن گیا ہے اس طرح کی قلب ماہیت اگر تصور کی جائے تو وہ ایک پیوند کی طرح دُور سے نظر آتی ہے لیکن اگر وہ فن کی بافت میں یوں دبے پاؤں در آئے کہ خود بافندہ کو بھی اُس کی آہٹ محسوس نہ ہو تو وہ فن کے تار و پود میں ایک فطری نقش کی طرح اُبھرتی ہے۔

"قاہرہ کی پہلی نظم" جو خود اس مجموعے کی پہلی نظم بھی ہے، اپنے عنوان سے اپنے موضوع کا کچھ سراغ نہیں دیتی۔ پہلی اور پھر دوسری خواندگی میں اس کے پرت آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ یہ نظم سیرتِ مطہرہ کے ایک مخصوص پہلو کو روایتِ محض کی حدود سے آگے لے کر شدتِ احساس کے وسیلے سے قاری پر طاری کرتی ہے اور نظم کی قرأت کو ایک کیفیت اور قلبی جذبات کی سطح تک پہنچا دیتی ہے۔

عنوان کی فوری گرفت سے ماورا یہ نظمیں ہر قرأت کے ساتھ پھیلتی ہیں اور ہر بار ایک وسیع تر دائرہ بناتے ہوئے اپنے موضوع کی پہنائی کا سراغ دیتی ہیں جو عنوان کی مُٹھی میں بند نہیں ہو سکتا۔ متعدد نظمیں، جو ایک سفر نامے کا سا تسلسل لیے ہوئے ہیں، اِس قوی احساس کی امین معلوم ہوتی ہیں کہ تلاشِ رزق یا کسی اور محرک کے تحت اپنی زمینوں سے ہجرت کر جانے والے پرندوں کو یہ بات ذرا دیر سے معلوم ہوگی کہ یہ ہجرت لاحاصل تھی اور سب کچھ وہیں تھا جہاں سے اُڑ کر وہ دُور دُور کے دیسوں میں جا اُترے۔ یوں شاعر کی آنکھ پرواز کے دوران نشیمن پر مرکوز رہتی ہے اور وہ مہاجر پرندوں کے لیے یہ پیش گوئی کرتا ہے:

"یہ جھیلیں ایک دن باہر نکالیں گی
کبھی ڈوبے ہوؤں،
بھولے ہوؤں، بھٹکے ہوؤں کو

وہ ساری تابنا کی جو مناظر میں دمکتی ہے
بدن تک ساتھ دیتی ہے
کسی دل تک نہیں جاتی۔''

بعض نظموں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اقبال کی پیروی میں زاہد منیر کی جہاں بینی بھی اُس دروں بینی تک لے جاتی ہے جو مسجد قرطبہ کے ستونوں میں صحرائے شام کا ہجومِ نخیل اور اُس کے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور دیکھ سکتی ہے۔ زاہد منیر کو بھی استنبول کی قدیم عمارتوں کی جبینوں میں وہ راز پنہاں دکھائی دیتے ہیں جو کسی صاحب نظر کے منتظر ہیں۔نظم ''ماریشس''اُس اندوہ کی امین ہے جو اس دُور افتادہ جزیرے کے آباد ہونے کے پس منظر میں موجود ہے مگر ہر ایک کو محسوس نہیں ہوتا:

''سیاہ باطن، سفید آقا
اجل بنے تھے
کسے خبر تھی کہ کون کیا ہے
بس اِک جزیرے کا خواب سونا بنا ہوا تھا
شکر کا اور نے شکر کا سونا''

اِسی مجموعے میں ہمہ گیر ناسٹلجیا کی ایک رَو بھی جابجا نمایاں ہے جس کی پہنائی میں کچھ خواب، حسرت و یاس کا پیرہن پہنے، غرقاب دکھائی دیتے ہیں، مگر حسرت ویاس ہی ان کا تنہا motif نہیں ہے۔ کہیں کہیں ایک غیر مغلوب اُمید بھی اپنی چمک دکھاتی ہے جس کی ایک مثال ''ایران کی پہلی نظم'' ہے۔

ان نظموں میں جابجا اُبھرنے والے ریت پر لکھے ہوئے نام ، دل کی دیوار پر آویزاں تصویر، آسمان سے برستے ہوئے موتیوں میں کھلتے ہوئے پھول، کچھ رومانی خواب، کچھ دل میں کلبلاتی آرزوئیں، کچھ آنکھوں میں بستی تعبیریں، یہ سب زندگی کے اُس حسن کے

آئینہ دار ہیں جو ہر دل کی حسرتوں میں موجود اور خارج میں ناموجود رہتا ہے۔

''ستارہ'' ایک بار بار اُبھرنے والی تمثال ہے جو شاعر کے بطون کی مؤثر عکاسی کرتی ہے۔ ستارہ اپنے گردو پیش سے الگ، دسترس سے دور مگر نگاہ سے پیہم مربوط، مسلسل لبھانے اور کبھی ہاتھ نہ آنے والی پُرکشش علامت ہے، جس سے ہم آہنگی محسوس کرتے ہوئے شاعر خود کو بھی ایک تنہا ستارہ قرار دیتا ہے ''ستارے میرے مونس ہیں'' اور ''صدیوں کے بیچاک میں دمکتا ستارہ'' اس ضمن میں قابلِ توجہ نظمیں ہیں جن میں آخرالذکر اپنے کرافٹ کی مضبوطی اور آمد کے وفور میں اس مجموعے کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

''لہروں کی ملاقاتیں'' میں ''ستارہ جگمگایا / نیل میں طغیانیاں آئیں'' ایک تاریخی حق رکھتا ہے۔ ستارۂ شعریٰ (Sirius) کا طلوع نیل میں طغیانی کا پیش خیمہ تھا اور یہ بات پہلے پہل صرف پروہتوں کو معلوم تھی چنانچہ آسمانِ سحر پر اس کا طلوع دیکھ کر وہ فصل بونے کے منتظر کسانوں کو آنے والی طغیانی کی اطلاع دے کر اپنے تقدس کا جوا، اُن کے کاندھوں پر جمائے رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ سب کو ستارے کی خبر ہوگئی اور وہ لائقِ پرستش ٹھہرا۔ تاہم یہ نظم جو اس تمثال سے شروع ہوتی ہے، مچلتی ہوئی لہروں کے ساتھ اس کے موضوع میں ایک موڑ آتا ہے اور وہ آسمان سے اُتر کر زمینی حقائق سے پیوست ہو جاتی ہے۔

''بچھڑ جانے والوں سے پہلی رات کا مکالمہ'' مرگ اور بعدِ مرگ کی حقیقت پر اُن عمیق سوالات کی عکاس نظم ہے جو نہ پہلی بار دلوں میں پیدا ہوئے ہیں اور نہ پہلی بار زبان پر لائے گئے ہیں مگر ذاتی احساس کی آنچ نے انھیں اس قدر حدت عطا کر دی ہے کہ بار بار کہی ہوئی یہ باتیں پہلی بار کی طرح لگتی ہیں۔

کچھ نظمیں دنیا کی سنگینی سے باہر کُھلنے والے اُس رنگین دروازے کی کلید مہیا کرتی ہیں جس کے پار حسن و خیر کی دل کش دنیا آباد ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ان نظموں میں

پنہاں اندر کا یہ پائیں باغ، یہ Door in the Wall بے رحم حقائق کی تپش میں ہانپتے زخمی دلوں کے لیے ایک ملجأ و مامن مہیا کر سکے گا اور "کھردری کھالوں کے زندانوں" میں جکڑی روحوں کو ہر طرف بکھری ہوئی حسن کی فراوانی کی طرف متوجہ کر سکے گا جو صرف ایک نگہ کے فاصلے پر ہمہ وقت موجود ہے۔

خورشید رضوی

۲۰/جون ۲۰۲۱ء

باتیں کرتی نظمیں

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں اور مختلف زبانوں پر اُن کی دسترس کا تو مجھ سمیت ایک زمانہ قائل ہے لیکن ان کی نظموں کا تخلیقی حسن، انوکھا پن اور موسیقیت بھی اپنی جگہ پر ایک فضا اور مقام رکھتے ہیں اور یہ بات ہے کہ ان کی شخصیت کے مخصوص ٹھہراؤ اور عالمانہ تاثر کے باعث اس طرف ادبی دنیا کی توجہ نسبتاً کم کم رہی ہے۔ کئی مشاعروں اور شعری نشستوں میں ان کو سننے کا اتفاق تو بار ہا ہوا ہے مگر ہر بار ان کی سنجیدہ طبعی اور علمیت کا احساس اس قدر غالب رہا کہ بطور شاعر وہ مولانا حالی کے اس مصرعے کی طرح ہی رہے کہ ''اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے'' مگر اب جو اُن کی بہت سی نظموں کو (جو کتابی صورت میں شائع بھی ہو رہی ہیں) ایک ساتھ پڑھنے اور ان کے موضوعات کی وسعت، داخلیت اور اظہار کی کاری گری کو تفصیل سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے تو ان کے لیے فوری طور پر میرے ذہن میں جو ترکیب اور عنوان اُترے وہ ''بولتی ہوئی نظمیں'' یا باتیں کرتی نظمیں کے گرد ہی گھوم رہے ہیں۔

امیجری یا تمثال کاری یوں تو شاعری کی ہر صنف میں رواں دواں ہیں مگر میرے نزدیک ان کا روپ ''نظم'' کی شکل میں سب سے زیادہ دلکش اور متنوع ہوتا ہے کہ اس میں

کسی مثال کے مختلف شیڈز کو ایک جگہ جمع کر دینے سے جو گلدستے کی سی صورت بنتی ہے وہ شاید کسی اور صنف میں اس طرح سے ممکن نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نظمیں ایک ہی وقت میں خودکلامی اور مکالمے یعنی Monologue اور Dialogue دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی ایک ایسی حیرت انگیز اور پُرلطف خصوصیت سے متصف ہیں کہ جیسے آپ کسی منظر کو ایک ساتھ دوربین اور خوردبین سے دیکھ رہے ہوں۔

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ خوبی نظموں کے عنوان سے لے کر آخری لائنوں تک نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے مثال کے طور پر چند عنوانات دیکھیے جو اپنی جگہ پر مکمل مصرعے بھی ہیں:

''آنکھوں میں چھپے موتی''، ''چلو تصویر سے پوچھیں''، ''سمے کا پارکھ''، ''کرن، خاک اور خواب''، ''مٹھیوں میں بند خواب''، ''رکو، دیکھو''، ''سینے میں سانس لیتی کرن''، ''تمھارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں''، ''صدیوں کے پیچاک میں دمکتا ستارا''، ''کوئی شجر کسی پرندے سے''، ''یہی دن تھے''، ''محبت آزمائیں گے''، ''نظم تم سے کلام کرتی ہے''، ''ترا عکس آئنوں میں''، ''اداسی کو بہانا مل گیا ہے''، ''تمھیں کیسے مناؤں''، ''بچھڑ جانے والوں سے پہلی رات کا مکالمہ'' وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ نظم گو شاعر اپنی نظم کے پہلے مصرعے کو ہی عنوان بنا لیتے ہیں لیکن زاہد منیر عامر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اتنے خوش رنگ اور خوش صوت مصرعے ہونے کے باوجود ان میں سے بیشتر کو عنوانات تک ہی محدود رکھا ہے اب آیئے کچھ نمونے خودکلامی اور مکالمے کی ملی جلی فضا کے بھی دیکھتے ہیں۔ زاہد منیر عامر نے یہاں بھی علامت کے حسن کو بہت کفایت سے برتا ہے اور زیادہ تر نظموں کا اختتام ایک ایسے انداز میں کیا ہے کہ نظم استعارہ در استعارہ چلنے کے باوجود ایک نوع کی شاعرانہ statement کا سا تاثر دیتی ہے۔ مکمل نظم (اپنے عمومی اختصار کے باوجود) درج کرنے کی گنجائش چونکہ کم ہے اس لیے مختلف نظموں کی چند جستہ جستہ لائنوں پر اکتفا کرنا پڑے گا یہ اور بات ہے کہ ان بکھری ہوئی لائنوں میں بھی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جنھیں زاہد منیر عامر کی نظموں کی پہچان اور انفرادی خصوصیت کہا جا سکتا ہے:

''محبت سے پہلے
کسی روپ میں دلکشی نے بسیرا کیا ہی نہیں تھا
نئی زندگی اور نئے روز وشب ہیں
نئے سلسلوں میں بجی ہیں بہاریں
محبت سے پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا!

(محبت سے پہلے)

....

میں شیشے کی دیوار میں قید ہوں اور
یہی آب وگل ہے یہی سبزہ وگُل
انہی پتھروں میں مجھے ڈھونڈنا ہے
وہ نغمہ کہ جس سے رواں ہے یہ پانی
مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے''

(ایکویریم)

....

''لیکن کسے فرصت ہے؟
رک کر وہ ہمیں تھامے
اور کون ہے جو روکے؟
ہر ایک کی دنیا کے
کچھ اپنے مسائل ہیں:

(آنکھوں میں چھپے موتی)

....

''تمھاری ضرورت سے میں آشنا ہوں
مرے سحر سے تم مگر بے خبر ہو
بتائے دنوں کو بدلنے کی قیمت
وہ دن ہیں ابھی منکشف جو نہیں ہیں
فزوں تر ہے تم سے ہمارا تخیل''

(کریڈٹ کارڈ)

....

"تمھاری آنکھ کے روشن ستارے نے
مہ و مہر و فلک کے استعارے نے
تمناؤں کے دھارے نے
تمھارے خواب نے بے خواب آنگن کو اُجالا ہے
مگر یہ خواب............
یہ تعبیر سے نا آشنا، سپنا" (رُکو، دیکھو)

اگرچہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی شخصیت کے بہت سے رنگ ڈاکٹر خورشید رضوی سے ملتے جلتے ہیں مگر شاعری کی حد تک دونوں کے راستے یکسر جدا جدا ہیں، زاہد منیر عامر کی جہاں گردی نے ان کے اسلوبِ شعر اور اندازِ نظر میں جس وسعت اور گہرائی کو یکجا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کہ ان نظموں میں ایک حساس دل کی دھڑکن اور ایک وسیع المطالعہ اور حقیقت پسند دماغ کی معاملہ فہمی ایسی ہے کہ جو ان کو اپنے ہم عصر شاعروں سے واضح طور پر ممیز اور ممتاز کرتی ہے اور جدید بین الاقوامی رویّوں اور نظریات کا ایک ایسا منظر نامہ بناتی ہے کہ ہر منظر دامنِ دل کو کھینچتا اور نت نئے سوال اٹھاتا چلا جاتا ہے اور یوں ہر نظم آپ کو باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

امجد اسلام امجد

عرضِ شاعر

آتے دنوں میں گم...... میرا نیا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ترتیب پانے کے بعد بھی بہت سی نظمیں کہی جا چکی ہیں جو اپنے مزاج کے فرق کے باعث ایک الگ مجموعے کا جواز رکھتی ہیں۔ میری ناچیز شعری کاوشوں کو نگاہ التفات سے دیکھنے والے رائے زنوں نے اپنی تحریروں میں جن نظموں کا حوالہ دیا، ان کا شمول ضروری تھا اس لیے بادۂ نو کے ساتھ بادۂ دیرینہ بھی نذرِ قارئین ہے۔ مجھے شکریہ ادا کرنا ہے جناب ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب امجد اسلام امجد، جناب جمیل یوسف اور ڈاکٹر سعادت سعید صاحبان کا جن کی نگاہ التفات سے ان منظومات کے اعتبار میں اضافہ ہوا۔ جناب عبدالستار عاصم اور ان کے ادارے قلم فاؤنڈیشن کا بھی شکریہ جنھوں نے تحقیقی و تنقیدی کتب کے ساتھ ایک شعری مجموعے کو بھی اپنے اشاعتی پروگرام کا حصہ بنایا۔

زاہد منیر عامر

لاہور

١

قاہرہ کی پہلی نظم

(اسارٰی بدر کے فیصلے کا ایک لمحہ)

دمکتا ہوا ہار لَو دے رہا تھا
پچھلے زمانے تھے اس آئینے میں
محبت کے کچھ عکس
کچھ ان دنوں کے
ابھی جب نبوّت نے کاندھے جھکائے نہیں تھے
کہ جب زندگی نے لہو رنگ لمحے دکھائے نہیں تھے
وہ اک نور ہالہ حرم سے حرا تک......
پہاڑوں کے دامن میں گُل کِھل رہے تھے
دمکتے ہوئے ہار میں خوشبوئیں تھیں

وہ زینبؓ، وہ بیٹی، وہ بیٹی کی خوش بو
خدیجہؓ کی خوش بو
وہ خوشبو کا بادل، محبت کی برکھا
وہ بطحا کے دن، یہ مدینہ کی آنکھیں
مناظر تھے جل تھل
نبوّت کے اشکوں نے اس ہار کو سیر بیں کر دیا تھا
.......................اگر تم کہو تو
یہ فدیہ بھی دے دوں
ابوالعاص کو میں رہائی بھی دے دوں
نبوّت کا سینۂ محبت کا طوفاں
ابوالعاص لیکن کنارے کھڑا تھا

☆

ایکویریم

میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا
میں پانی میں ہوں اور کچھ بلبلے میرے جینے کا سامان ہیں
میں خود آبلہ ہوں
مجھے ٹھیس پہنچے ذرا سی بھی کوئی
مرے روز و شب ریزہ ریزہ بکھر جائیں گے
اور میں پھر سے پانی میں بہنے لگوں گا
مرے سامنے وسعتیں بیکراں ہیں
مگر بے کرانی ہے حد نظر تک
میں شیشے کی دیوار میں قید ہوں اور

یہی آب و گِل ہے
یہی سبزہ و گُل
انھی پتھروں میں مجھے ڈھونڈنا ہے
وہ نغمہ کہ جس سے رواں ہے یہ پانی
مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے

☆

آنکھوں میں چھپے موتی

آنکھوں میں چھپے لفظوں
ہاتھوں میں چھپے لیکھوں
سینوں میں دبے جذبوں کو کس نے یہاں سمجھا......
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں
جب وقت مہکتا ہے
ہر شاخ پہ شادابی
مستی میں لہکتی ہے
جب پیار نمو بن کر
شاخوں سے ٹپکتا ہے
اُس وقت بھی دنیا کو

اِس حسن سے ملنے کی
فرصت ہی نہیں ہوتی
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں
سرمست شبابوں کے
اور آنکھ سے خوابوں کے
جب قافلے چلتے ہیں
سونے کی تمازت کو
چاندی سے بدلتے ہیں
سپنوں کو ٹھہرنے کی......فرصت ہی نہیں ہوتی
وہ کون ہے جو رُک کر
جاتے ہوئے لمحوں کو......دھیرے سے بلا لائے
من روپ سجا پائے
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں
ساحل سے سفینوں کو
ملتا ہے اشارا جب
آنکھوں میں چھپے موتی
کرتے ہیں کنارا جب
من روپ مچلتا ہے
ہر رنگ بدلتا ہے
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں

مٹھیوں میں بند خواب

میں اپنی مٹھیوں میں بند خوابوں کا محافظ ہوں
بلندی پر بہت سے موڑ میرے راستے میں ہیں
جھکی ہیں ٹہنیاں ہر موڑ پر۔۔۔۔۔۔۔۔
چاہوں تو میں ان ٹہنیوں کو تھام سکتا ہوں
مگر نیچے بہت ہی مستعد ہیں کھائیاں خوابوں کے کھانے کو
اگر چاہوں لٹکتی ڈالیوں کو تھام لوں
لیکن میں اپنی مٹھیوں میں بند خوابوں کا محافظ ہوں

☆

کریڈٹ کارڈ

تمھیں اپنے تاریک لمحوں کو روشن بنانے کی خاطر
سنورنے کی خاطر
جو گزرا سو گزرا
اب آتے دنوں سے نگاہیں ملانے کی خاطر
چمکتی دکانوں کی وہ تابناکی
............کہ جس سے ستارے بھی شرمارہے ہیں
بتدریج اس سے سجانا ہے آنگن
تمھیں کیا خبر ہے زمانہ بہت دور تک جا چکا ہے..................
زمانے نے اپنے تقاضوں کے دامن کو بے طرح پھیلادیا ہے
تمھاری ضرورت کی مجھ کو خبر ہے

تمھیں اپنے بچوں کی خاطر
زمانے کی خاطر
بدلنا ہے اس پست معیار کو
جس پہ اب تک ......رواں تم رہے ہو
تمھاری سواری، تمھاری رہائش، تمھارا اسٹیٹس
بس اب ان کو بدلو......
الہ دین ہوں میں
مرے نرم ہندسوں میں جادو چھپا ہے
مشینوں کی نازک رگڑ اک کرشمہ
نتیجہ ہے جس کا تغیر......تحیّر
تمھاری ضرورت سے میں آشنا ہوں
مرے سحر سے تم مگر بے خبر ہو
بِتائے دنوں کو بدلنے کی قیمت
وہ دن ہیں ابھی منکشف جو نہیں ہیں
فزوں تر ہے تم سے ہمارا تخیّل......

☆

چلو تصویر سے پوچھیں

تمھارے دل کی ہر تحریر میں
تصویر ہے بیتے دنوں کی
تصور کی، تخیل کی ....
تصور آسماں پر اک جہاں تخلیق کرتا ہے
تخیل رنگ بھرتا ہے
بنا آہٹ، خموشی سے
یہی تصویر، دھیرے سے
نشیلے آئنوں سے ہو کے دل میں جا اُترتی ہے
چلو تصویر سے پوچھیں ......
وہ سب سپنے، وہ سب باتیں

لبوں سے پھوٹتے جھرنے
وہ آنکھوں سے لگی رم جھم
کبھی اس پر بھی اترے تھے
گریزاں ساعتیں رقصاں ہوئیں
دل میں شرر بن کر......؟
تماشا رنگ پر تھا اور مژہ برہم نہ ہوتی تھی......
مگر تصویر تو دیوار پر ہے
اور اس کی نیم وا آنکھوں میں حیرت ہے

☆

ریت پر نام لکھا

ریت پر نام لکھا......
تیز ہواؤں نے کہا:
نام جو دل پہ لکھا تھا
کبھی پانی میں بہا
اور صدف تک پہنچا
آسمانوں پہ گیا
اور ستاروں نے اسے
چوم کر دل میں رکھا
قطرۂ آب بنا
اور سحابوں نے اسے

کشت زاروں میں بکھیرا

تو اسے روپ ملا

سبزہ وگل میں ڈھلا

پھول گیا، پھیل گیا......

ریت پر نام لکھا۔

☆

یہی پرواز ہے جس کا مجھے ڈر ہے

"نہیں...... یہ خوش گمانی کب ہے
یہ سچ ہے، حقیقت ہے
اگر تم ہو
تو باقی آدمیت ہے
تمھارے دم قدم سے رت جگے روشن
تمھارے لفظ کی مہکار سے مہکا مرا آنگن
زرا دیکھو
کسی بامِ تمنا پر کوئی پرچم
ابھی اُبھرا
ابھی بل کھا کے لہرانے لگا ہے......"
یہی پرواز ہے جس کا مجھے ڈر ہے۔

شمسیہ

کبھی بارش برستی ہو
زمین و آسماں کے بیچ
اک چھتری تنی ہو
اور کسی خاموش رستے پر
چلیں ہم انتہاؤں تک
مگر رستہ وہ ایسا ہو
وہ بارش اس قدر برسے
کہ اس کی چھم چھما چھم میں
مسافر بھول جائیں

سمت اور منزل

کبھی رستہ الجھ جائے
کبھی ہو مہرباں بادل......................
اجالوں کو اُچک لے
فاصلوں کو ختم کر ڈالے
سمے کا روپ بدلے
وقت کی رفتار ٹھہرے
آسمانوں سے برستے موتیوں میں
پھول کھل اٹھیں
برستی ہی رہے بارش
ہُمکتی ہی رہے چھتری
مہکتا ہی رہے رستہ

☆

کون ہے......؟

کون ہے درد کی دولت جسے ارزانی ہو
کون ہے جو کبھی اعماق میں اُترے میرے
کون ہے جس پہ ہو روشن مرے سینے کی چبھن
مری پلکوں کی گرانی، مرے لہجے کی تھکن
کسمساتے ہوئے ایّام، لرزتی شامیں
کپکپاتے ہوئے باطن پہ مزیّن جوبن
کون دیکھے وہ جبیں جس میں ہیں پوشیدہ شکن
جس کی ہر سطر میں اک عمر کا ہے بوجھل پن
کون ہے جو کبھی دیکھے پسِ دیوارِ کہن
دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں چمکتے لمحے

یہ چمکتے ہوئے لمحے ہیں حسیں پیراہن
دیکھنے والوں نے گل دیکھے ہیں گلشن گلشن
دیکھنے والوں نے دیکھی ہے جبینِ روشن
یہ جو بے سطر جبیں، یہ جو مہکتے گل ہیں
اپنے دامن میں چھپے داغ پہ ہیں خندہ کناں

☆

ڈال سے کوئل اُڑ جاتی ہے

پتلے پتلے ہونٹوں پر ہیں
آنکھوں جیسی موٹی باتیں
''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو......؟
زلفیں، سپنے
پھول اور جذبے
اچھا ہاں اک بات بتاؤ!
کل تم اتنے چُپ چپ کیوں تھے......؟
خاموشی سے یوں لگتا تھا
جیسے سپنے ٹوٹ رہے ہوں
مجھے خبر ہے میری خاطر

تم نے کیا کیا..................''
کوکتے کوکتے ڈال سے کوئل اُڑ جاتی ہے
من کا مندر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے
''...........میں کیا جانوں تم نے کیا کیا دکھ جھیلے ہیں
اچھا آؤ وعدہ کر لیں
ایسی باتیں نہیں کریں گے
لیکن ہاں ناراض نہ ہونا
دیکھو مجھ سے ملتے رہنا
بولو اب میں جاؤں یہاں سے.................؟
میں اور وہ اب پتھر کے ہیں
اسی جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں
جانے کب سے گڑے ہوئے ہیں
اک پتھر میں آوازیں ہیں
اک پتھر میں سناٹا ہے
سناٹا آواز کا پردہ
آوازیں سناٹے کا
''بولو اب میں جاؤں یہاں سے.................؟
میں کہتا ہوں ......''جا سکتے ہو......؟؟؟''

☆

سینے میں سانس لیتی کرن

سحر ہوئی تو سنا سورجوں کی یورش کو
سیاہ شب کے لبادے اتار کر نکلے
شمار کرتے ہوئے بے کنار لمحوں کو
وہ ان گنت ذرّے
کہ جاگتے ہیں تو شانوں پہ بار دھرتے ہیں
میں دیکھتا تھا انھیں کچھ مگر نہ کہتا تھا
جو دن ڈھلا تو ڈھلی ناتواں توانائی
اٹھا وہ شور کہ دن دُھند میں لپٹنے لگا
سنا یہ شور مگر کچھ نہیں کہا میں نے

شفق نے تاروں کی چادر سے دن کو ڈھانپ دیا
کہیں افق میں چھپی جا کے ساری تابانی
میں روشنی کی لحد پر خموش جا بیٹھا
اب اک کرن مرے سینے میں سانس لیتی ہے
سیاہ شب کے ستاروں کو ماند کرتی ہے
پھسلتی ریت کے ذرّے اُجال دیتی ہے

☆

تمھارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں

تمھارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں
تمھارے ہاتھ مرمر کے کھلونے ہیں
...... وہ مرمر جس پہ احمر کا گماں ہے
یہ دیکھو! زندگانی کی لکیریں
یہ دولت کی، یہ شہرت کی، یہ عزت کی لکیریں ہیں
فرازِ شمس کتنا صاف ہے
باقی لکیریں بھی معیّن ہیں
مگر یہ کیا
یہاں آ کر لکیریں کیوں الجھتی ہیں
یہاں تو حال، استقبال سے یکسر گریزاں ہے

زرا ٹھہرو......تمھارے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں
یہ شبنم..................؟؟
کیا یہ شبنم ہے..................؟؟؟
دھواں ہے، دھند ہے، بنسی کی لے ہے
میں گویا کھو رہا ہوں
......یہ کیسی دُھند ہے......؟
اس دھند میں بے خواب ہے نرگس
اور اس نرگس پہ شبنم ہے
یہ اک مدھم سحر کی خامشی ہے
سحر ہے بار سے شبنم کے بوجھل
کبھی نرگس لرزتی ہے
کبھی نرگس ٹھہرتی ہے

☆

صدیوں کے پیچاک میں دمکتا ستارہ

وہ ستارہ جو بلندی پہ مکیں تھا
مرے باطن میں کہیں تھا
وقت کی دھند میں گم اس کی چمک
آسمانوں پہ تو لَو دیتی تھی
پر زمیں والوں کی آنکھوں سے بہت دور
چھپی رہتی تھی
نور کا پارہ، ستارہ کہ زمیں
جس کی چمک کی خاطر
اَن گنت صدیوں کے دامن سے اُلجھتی ہی رہی
اس نے خود صدیوں کے پیچاک کو یوں چاک کیا

سر بلندی کی رِدا بامِ فلک پر رکھ کر
میرے ہونٹوں پہ اُتر آیا وہ دھیرے دھیرے
اور اک عالمِ سرشاری میں
میں نے اسے چوم لیا

☆

رُکو، دیکھو

رُکو، دیکھو
تمھاری آنکھ میں کوئی ستارا ہے
تمھاری چاہتوں نے اس ستارے کو
تمناؤں کے اس آفاق سے نیچے اُتارا ہے
جہاں لمحے پگھلتے ہیں
جہاں سورج نکلتے ہیں
جہاں ایام ڈھلتے ہیں
مگر......صورت نہیں ڈھلتی
تمھاری آنکھ کے روشن ستارے نے

مہ و مہر و فلک کے استعارے نے
تمناؤں کے دھارے نے
..........تمھارے خواب نے
بے خواب آنگن کو اُجالا ہے
مگر یہ خواب..................
یہ تعبیر سے نا آشنا سپنا!

☆

لہروں کی ملاقاتیں

ستارا جگمگایا
نیل میں طغیانیاں آئیں
کنارے ، دور تک سرسبز ہو کر لہلہاتے تھے
کسانوں کی نگاہوں میں تشکر تھا
تشکر کی نگاہوں میں ستارا تھا
جسے اک روشنی کے بوجھ نے نیچے اتارا تھا
خیالوں میں ستارے نے زمینوں کو سنوارا تھا......
مگر لہریں کنارِ نیل میں اک دوسرے میں گم
بہت شاداں ، بہت فرحاں
کسی آتے سمے کی چاپ سے تھیں بے خبر یکسر

فقط پانی کا اک ریلا
بہا لے جائے گا لہروں کو
لہروں کو خبر کب تھی
کنارے دور رہ جائیں
تو لہروں کی ملاقاتیں
کبھی صدیوں میں ہوتی ہیں
ستارے دور سے ان فاصلوں کو دیکھ سکتے ہیں
مگر کچھ کر نہیں سکتے

☆

ایک نظم

سبھی حاضر ہیں
انساں بھی، پرندے بھی
درندے اور حیواں بھی
کہو کیا مشورہ ہے؟
ایک تحفہ ہے، عدم سے زندگی کے دائمی کرنے کو آیا ہے
اُتاروں گھونٹ اِس کے حلق سے نیچے کہ لوٹا دوں؟
محبت چاہیے اس زندگی سے' زندگی کی لو بڑھانے سے
ہمیشہ کے لیے بے خوف جینا...... بے بدل نعمت
کہا سب نے !
مگر بگلا نہیں آیا
وہ اک درویش اور گوشہ نشیں بگلا
سلیماں نے بلایا

مشورت چاہی:
کہو! یہ جام بہتر ہے کہ ترکِ جام بہتر ہے؟
وہ آبی مرغ جس نے عمر پانی میں بتائی تھی
پروں کو جھاڑ کر بولا
'' کہو یہ جام بہرِ دوستاں بھی ہے کہ تنہا تم ہی مالک ہو؟ ''
سلیماں نے کہا: تنہا
مجھے یہ جام پہنچا ہے
اب اس گوشہ نشیں بگلے نے پہلے جام کو دیکھا
پھر آنکھیں بند کیں، خاموش ہو بیٹھا
کچھ ایسا گم ہوا
مِنقار نے جُھک کر زمیں چھو لی
بھرا دربار سناٹے میں جا ڈوبا
اِک ایسا سحر، اب جس کو سلیماں توڑ سکتا تھا
سلیماں نے کہا: '' بولو ''
معاً آواز نے بگلے کی سناٹے کو یوں توڑا:
'' اگر اس جام کو پی کر جیے تنہا ''
کوئی ساتھی نہ چارہ گر
نہ کوئی دوست اور ہم دم
کہو: '' ایسی حیاتِ جاوداں کا کیا کروگے؟ ''

☆

سمے کا پارکھ

(ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے لیے)

گزرتے وقت
اس کی مانگ میں عمرِ گریزاں کا
نہ کوئی رنگ بھرنا
چمکتی، وقت کے اُس پار تکتی، دُوررَس آنکھوں کے روشن آئینے میں
بال مت لانا
سمے کے تیز زینے پر
سہج کر پاؤں دھرتے
خوش ادا لفظوں، لچکتے نرم جملوں

ڈور تک قوسیں بناتے دائروں کو
پھیلنے دینا
زمانے کی سماعت کو
جو کومل سُر میسر ہے
اسے مت چھیننا......
گدلے دنوں کی گرد نے پانی کا دامن تھام رکھا ہے......
وہ میلے دامنوں، میلے دنوں میں جگمگاتا ہے
کنول ہے، مسکراتا ہے
گُروں کے دائرے، اس کی نگاہوں میں
چمکتی شیشہ بازی ہیں
کوئی جادو سمے کا
یا گُروں کا، شیشہ بازوں کا
اسے مجبور کر سکتا نہیں ہے
کہانی کا ہر اک کردار
اپنا راز اس پر کھولتا ہے
زمانے سن!
ابھی وہ بولتا ہے

☆

کرن ،خاک اور خواب

(پروفیسر چودھری عبدالحمید صاحب کے لیے)

محبت کے جو لفظ
دل میں تمھارے ادھورے پڑے تھے
تمھارے عمل نے وہ روشن کیے
اُن کو پورا کیا.............
تمھارے شب و روز تو خارزاروں میں بیتے
مگر تم مہکتے گلابوں کی دھن میں
اُنھی خارزاروں میں خوشیاں اگاتے رہے......
تمھی تھے ،جسے خاک آلودہ کرنوں سے اتنا شغف تھا
کہ کرنوں کو سورج بنانے کی دھن تھی

کہ تم خود کرن تھے
چمکتی ہوئی اور مہکتی کرن تھے
مگر ایک گدڑی میں لپٹی کرن تھے
یہ گدڑی بھی مٹی میں رکھ دی گئی ہے
تمھاری کرن خاک سے خواب تک کا سفر کر رہی ہے
مگر میرے سینے میں زندہ ہیں وہ لفظ
جن کی حرارت
تمھاری نگاہوں میں لَو دے رہی تھی

☆

سروش کے لیے

تمھارے لہجے میں گنگناتے ہیں وہ زمانے
ابھی جو آتے دنوں میں گم ہیں
چمکتی آنکھوں کے دائروں میں
کرن ہے جس میں نیا زمانہ دمک رہا ہے
کھنکتے لفظوں میں صبحِ فردا کی آہٹیں ہیں
مری بصارت، مری سماعت
رُواں رُواں ڈوبتے بدن کا
اسی زمانے کا منتظر ہے
کہ جب تمھارا وجود ہو ایک استعارہ
حیات افروز روشنی کا

☆

٢

محبت امتحاں ہے

زرا دیکھو گزرتے روز و شب کو
ہر اک لمحہ ستارہ ہے
اگر تسخیر ہو جائے تو ہر لمحہ تمھارا ہے
تمھارے خوب صورت ہاتھ میں
سورج کی کرنوں میں
تمناؤں کی خوشبو سے مہکتی
چاند راتوں میں
ستارے ہی ستارے ہیں
انھیں تسخیر کر لو تو
تمھاری مانگ میں یہ سب ستارے جگمگائیں گے

ستارے اور آئیں گے
فلک بھی اور آئیں گے
اگر تم روشنی سے دوستی کر لو
تو یہ جانو کہ ہر لمحہ محبت کا نشاں ہے
محبت امتحاں ہے

☆

یہی دن تھے

یہی دن تھے کہ سینے میں کوئی شے ڈوب جاتی تھی
یہی دن آسمانوں سے ستاروں کے اترنے کے
یہی دن چاند کو دن رات ان آنکھوں میں بھرنے کے

یہی دن روشنی میں شمعِ جاں کو آزمانے کے
یہی دن لفظ کو جذبے کی خلعت سے سجانے کے
یہی دن روٹھ جانے کے ، یہی دن مان جانے کے
یہی دن تھے کہ خود کو اپنے گنبد سے نکالا تھا
شفق پھوٹی ، سحر آئی ، کسی پنچھی نے پر کھولے
نگہ اٹھی ، قدم لرزے ، یکایک آسماں ڈولے

سماعت نے پرِ پرواز سے امرت کا رس پایا
نگاہوں پر زمین و آسماں کا حسن اُتر آیا
زمانہ نور میں ڈوبا ، تمنا کا فسوں چھایا
یہی دن تھے کہ ہر جانب تمنا رقص کرتی تھی
سمندر نے صدف کی مانگ بھرنے کی بشارت دی
ہواؤں نے سمندر کے اچھلنے کی بشارت دی

لہکتی ڈال ہاتھوں میں مہکتے پھول لے آئی
ہوا خوشبو میں، خوشبو آرزوؤں میں سمٹ آئی
مری آنکھوں پہ اوّل اوّل اشکوں کی گھٹا چھائی
...................................یہی دن تھے

☆

محبت آزمائیں گے

نہیں!
اب ہم نہیں روٹھیں گے
اب ہم آسمانوں سے اترتے پیار کے پیغام کا رستہ نہ روکیں گے
نہیں، ہم
شاخچوں پر کوکتی کوئل کے نغموں کو سنیں گے
پھول کے دِل میں اترتی، لحہ لحہ ڈوبتی منقار دیکھیں گے
سحر دم ہر رخِ زیبا پہ لکھی آس اور امید کی تحریر پڑھ لیں گے
ستاروں کے سفر میں چاند کی منزل کو پائیں گے
محبت آزمائیں گے

چلو! نازک لبوں سے پھوٹتی کلیوں کی اک مالا بنائیں
اور اسے زیبِ گلو کر لیں
نگاہیں رو برو کر لیں
نگاہوں میں اترتے ساونوں سے ہم نئے منظر بنائیں گے
نئی دنیا بسائیں گے
محبت آزمائیں گے

☆

ڈاؤن سائزنگ

کانپتے ہاتھوں میں خط
آنکھوں میں رقصاں دائرے
دور ہوتا در، بچھڑتی منزلیں
اجلے کاغذ پر سیہ لفظوں کے پیچیدہ نقوش
ڈولتے قدموں سے گھر کی سمت جاتی راہ پر
ان گنت چہروں کے بے چہرہ نقوش
رحمتیں ۔۔۔ہاتھوں کی پیلاہٹ کے دن
ماں۔۔۔دعاؤں کی سنہری ڈور باندھے منتظر

کھلکھلاتے پھول۔۔۔ مستقبل سے یکسر بے خبر

اک شریکِ جبرِ زیست۔۔۔
ایک کاغذ سب کو اپنی آگ میں جھلسا گیا
جگمگاتے دن اندھیرے بن گئے
اشرف المخلوق اس دنیا کا بوجھ
ایک دم بے کار، بے مصرف، فضول
دور تک آنکھوں میں تاریکی کی دھول

☆

اداسی کو بہانہ مل گیا ہے

اداسی یوں تو اس دھرتی کی مٹی میں گندھی تھی
گھنے اشجار سے پتوں کی صورت پھوٹتی تھی
فضاؤں میں ترنم ریز آوازوں میں ڈھل کر
اداسی کی خنک لہریں، رگِ جاں میں سرایت کرتی جاتی تھیں
سمندر سے اداسی ڈولتی، بل کھاتی، ساحل سے گریزاں
جب کبھی لنگر اٹھاتی تھی
چمکتے موتیوں کے ہار اپنے ہاتھ میں لے کر
اسی دھرتی کی جانب لوٹ آتی تھی
.... یہ سب کچھ تھا
مگر یہ ہے تمھیں دیکھا نہیں تھا

تمھیں دیکھا، تمھاری یاد کے غنچے کھلے اور پھر
گھنے اشجار پر
دھرتی کے شرق و غرب میں پھیلی
ترنم ریز آوازوں، فضاؤں اور ہواؤں میں
چمکتی قوس میں اور آسمانوں سے اترتے موتیوں کی آبشاروں میں
سرِ ساحل، سرِ صحرا اُداسی ہی اُداسی ہے
اُداسی کو بہانہ مل گیا ہے

☆

ستارے میرے مونس ہیں

ستارے میرے مونس ہیں
بہت تاریک راتوں میں مرے ہمراہ چلتے ہیں
مری افسردگی کو دیکھ کر، افسردہ ہوتے ہیں
مجھے جب قعرِ غم میں ڈوبتا دیکھیں
تو مجھ پر مسکراتے ہیں
مجھے باہر بلاتے ہیں
اندھیرے لاکھ ہوں لیکن
ستارے جگمگاتے ہیں
مجھے رستہ دکھاتے ہیں
کہ میں اقلیمِ غم کا ایک روشن استعارہ ہوں

مجھے ایام کی تاریکیوں میں اک ستارہ ہوں
کوئی غم رفتہ رفتہ جب مرے اندر اترتا ہے
میں اس پر مسکراتا ہوں
اسے باہر بلاتا ہوں
ستارے میرے مونس ہیں
میں اک تنہا ستارہ ہوں

☆

کہاں ہوتم ؟

کہاں ہوتم
جہاں سے اس طرف کوئی خبر آتی نہیں ہے
سنا یہ تھا:
بلندی پر پہنچ کر سب نظر آتا ہے، لیکن
تمھاری صورتِ زیبا نظر آتی نہیں ہے
نہ وہ آواز ہے جس کی نشیلی گنگناتی آہٹوں میں
لمحہ لمحہ پھول کھلتے ہیں
(اجالے مجھ سے ملتے ہیں)
نہ وہ رفتار جو کلکِ قدم سے
اک پیامِ آسمانی کو

زمینی زایچوں میں نقش کرتی ہے
(صبا جس سے بہت بچ بچ کے چلتی ہے)
جھروکے، جب جھکیں تو
نشہ سا چھا جائے منظر پر
کھلیں تو
روشنی ہو بام و در پر
وہ بے باکی تکلم جس میں ہو گم
کہاں ہو تم ......؟

☆

مجھے جلدی بہت تھی !

مجھے جلدی بہت تھی
اس لیے
جملے بھٹکتے تھے
بہت سے لفظ، باتوں میں
نشست اپنی بدلتے تھے
بہت سرگوشیاں
میری سماعت پر اترتی تھیں
سماعت سے زرا آگے مگر جلدی کا پہرہ تھا
میں سنتا تھا پہ بہرا تھا
سر رہ ریختہ پتوں کو سننے

مسکراتے پھول چننے
یا نشیلے بادلوں کو دیکھنے کی بھی
ذرا فرصت نہیں تھی......
بہت دن سے سدا کل پر اٹھا رکھے ہوئے سپنے
یہ آوازیں، یہ نظارے
ضروری کام یہ سارے
بالآخر راستے میں آملے ہیں
سوچتا ہوں
کیوں مجھے جلدی کا سودا تھا......؟؟

☆

تمھیں کیسے مناؤں

تمھیں کیسے مناؤں
کس طرح نازوں بھری پلکیں اٹھاؤں میں
کہوں کیا لفظ
جس سے
ناخوشی کا سحر ٹوٹے
بادلوں میں چاند پھوٹے
آئنے سے زنگ چھوٹے
آسماں پر کہکشاں کا سلسلہ آغاز ہو جائے
پکاروں ایسے لمحے کو
جہاں رفتہ نہ آئندہ، فقط ہم تم میں لمحے گم رہے ہوں......

ستاروں سے تمھاری مانگ بھرنے
وقت کو زنجیر کرنے
زیست کو تسخیر کرنے
اور دنیا سے نہ ڈرنے......کا کروں وعدہ؟
تمھیں کیسے مناؤں میں؟؟؟

☆

حقیقت واہمہ ہے

حقیقت آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے
بظاہر منزلیں
لیکن ہماری آرزوئیں بھی
فقط صحرا کے چشمے ہیں
کسی چہرے کی رعنائی
کسی منظر کی زیبائی
کوئی رفعت، کوئی عظمت
کوئی دانائی، رسوائی
یہ سب اک کینوس پر
جا بجا رنگوں کے دھوکے ہیں

اگر رنگوں کو ہم چھو لیں
تو یہ سب نقش مٹ جائیں
حقیقت واہمہ ہے
آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے

☆

بچھڑ جانے والوں سے پہلی رات کا مکالمہ

سناؤ کہاں ہو؟
وہ آنسو
جو تم سے بچھڑنے پہ لوگوں کی آنکھوں سے ٹپکے
پہنچ پائے تم تک......؟
کہ یونہی ہوا ہو گئے؟
وہ آواز میں ڈھل کے نغمے سناتی
لپکتی، لہکتی، دہن سے نکلتی
کبھی آہ بھرتی، کبھی مسکراتی
وہ لچکیلی، چمکیلی، ریشم کی ڈوری
وہ ڈوری جو ٹوٹی......تو کیسا لگا تھا؟

بہت سال سے نیند کا تجربہ تو تمھیں تھا
مگر اب جو جاگے ہو......کیا دیکھتے ہو؟
ہمیں بھی بتاؤ......!
ہماری نگاہیں......تو مٹی کے اک ڈھیر پر رک گئی ہیں
مگر اب تمھیں تو پتا ہے
کہ مٹی کا یہ ڈھیر
ققنس ہے......
برزخ ہے......
یا صرف اڑتی ہوئی راکھ کا سلسلہ ہے؟؟؟

☆

لرزتی لہروں کا خاموش فیصلہ

بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے
ابھی تو موسموں کی ڈالیوں پر پھول کھلنا تھے
ابھی تو ابر کو چاروطرف سے گھر کے آنا تھا
ابھی کچھ حرف تھے جو لفظ کی صورت کو تکتے تھے
ابھی تو عمر کے بادل سرِ صحرا چمکتے تھے
یہ تم نے کیا کیا؟
جلدی میں ایسا فیصلہ ...... اور یوں
چراغِ دل کی لو اس فیصلے سے ڈگمگائی ہے
چمکتی صبح کی گلیوں میں کیسی رات آئی ہے

تمھارے صبر کو جلدی کی رہ کس نے سجھائی ہے
وہ دھرتی مدتوں جو قطرۂ شبنم کو ترسی ہے
تمھارے فیصلے نے کس طرح سیراب کر ڈالی
زرا دیکھو محبت کس طرح آنکھوں پہ برسی ہے……
محبت کا تقاضا تھا کہ تم کچھ دن ٹھہر جاتے
وہ دل جن پر تمھارے پیار کے کچھ حرف اترے تھے
وہ ان سے سائباں بُن کر
زمانے کی چمکتی دھوپ میں کچھ دن اماں پاتے
مگر تم کو تو جلدی تھی
تمھارے سانس کی لہریں لرزتی تھیں
محبت کو نگاہوں میں تڑپتا چھوڑ کر
تم نے یہ کیسا گھر بسایا ہے
یہ وہ منزل ہے جس میں کوئی اپنا، نے پرایا ہے
بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے

☆

ابھی کچھ کام باقی ہیں

ابھی کچھ کام باقی ہیں
کتابوں سے گزر کر دل میں جا بیٹھا ہے جو
وہ نام......مٹنا ہے
کسی گنجینۂ امروز کو
ماضی کا پیراہن پہننا ہے
ابھی پھولوں سے اور پھولوں کی خوشبو سے
مجھے آگے گزرنا ہے
لکیروں میں ابھرتی صورتوں کو محو ہونا ہے
تمنا کی جہانگیری، بہت دن دیکھ لی میں نے

حقیقت کو
تمنا کے سرابوں سے
بس اب آزاد ہونا ہے

☆

محبت! شکریہ تیرا

میں اک تنہا شجر
سورج کی حدّت میں پگھلتا تھا
گزرتے وقت میں گرہوں پہ گرہیں پڑتی جاتی تھیں
کوئی بادل مرے آکاش پر کم ہی اترتا تھا
پھر اک دن یوں ہوا
بادل نے مجھ سے دوستی کر لی
مرے آکاش پر اُترا
مجھے دیکھا
مجھے سرشار کر ڈالا
مری سوچوں میں رعنائی

سماعت پر مری دستک
مری آنکھوں میں خواب اترے
محبت ! شکریہ تیرا

☆

محبت پھول ہے لیکن ....

محبت سیل ہے بنجر زمیں کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے
نم دیتا، اندھیروں کو اجالوں میں بدلتا، زندگی بن کر چمکتا ہے
---پھر اک دن بیج بن کر
ساری سنگینی کا سینہ چیر دیتا ہے
بہت طوفان آتے ہیں
یہ ننھی شاخ اپنا ننھا سینہ تان لیتی ہے
یہ طوفانوں کو خاطر میں نہیں لاتی
اور ان سے تن کے کہتی ہے:
قبا میری ہے اس کو چاک کرنا بھی مرا حق ہے

شگفتن روک سکتے ہو تو روکو!
ہوائیں ہار جاتی ہیں
زمانہ مان جاتا ہے
نزاکت سے بھری ڈالی
ثمر ور ہو کے رہتی ہے
محبت پھول ہے
اک دن ہواؤں اور طوفانوں سے لڑ کر جیت جاتا ہے
مگر پایندگی اس کی
مگر تابندگی اس کی
شگفتن سے شکستن کا سفر کرتی ہی جاتی ہے
ہوا شاخوں میں آ کر سرسراتی ہے
یہ کہتی ہے:
محبت پھول ہے لیکن
اسے اک دن بکھرنا ہے

☆

چراغِ نفس ہے چراغِ محبت

(۱)

پلٹ جائے گر وہ
پکارو نہیں تُم
اسے اپنے دل سے اتارو نہیں تُم

(۲)

صدا دل سے نکلے، اُتر جائے دل میں
سنا ہے یہ ہم نے!
مگر پھر یہ کیا ہے
کہ خیزد نہ ریزد

(۳)

الاؤ۔۔ جو کل تک دہکتا تھا دل میں
اسے کھا گئی سرد مہری جہاں کی
چراغ اک ابھی تک مگر جل رہا ہے

(۴)

تہِ دل میں روشن چراغِ محبت
نگاہوں پہ ہے خانماں کی تباہی
کوئی دم کا مہماں چراغِ نَفَس ہے
چراغِ نَفَس ہے چراغِ محبت

(۵)

تصور، تخیّل، تاثر؛ محبت
مہکتی ہے نو خیز سبزے کی صورت
وہ بوڑھا شکاری، وہ مقراض اس کی
چمکتے ہیں سبزے پہ تلوار بن کر

محبت سے پہلے......

محبت سے پہلے
کسی روپ میں دل کشی نے بسیرا کیا ہی نہیں تھا
چمکتی نگاہوں سے اس آئینے پر
کرن کوئی اتری نہیں تھی
جہاں اب ستاروں کے جھرمٹ سجے ہیں
کسی زلف کے بَل میں دِل کے الجھنے کا
امکان کب تھا......؟
محبت سے پہلے!
محبت سے پہلے یہی پھول تھے، ان میں خوشبو نہیں تھی
یہی چاند تھا...... چاندنی کب تھی اس میں

ستاروں میں ٹکڑے نہ تھے میرے دل کے

مرے شہر کے موسموں میں تھی شدّت
مگر ان میں کوئی حرارت نہیں تھی
حرارت نہیں تھی ...... محبت نہیں تھی
مرے ملنے والوں کے لہجوں میں پیغام ......
کچھ بھی نہیں تھا
نئے دن تو آتے تھے لیکن
کوئی بافت بن کر، کوئی رسم بن کر
مگر اب جہاں تک نظر ہے
نئے راستے ہیں
نئی زندگی اور نئے روز و شب ہیں
نئے سلسلوں میں سجی ہیں بہاریں
دنوں میں ہے ساون
تو راتوں میں شبنم
کھنکتا ہے لہجہ
چمکتے ہیں لمحے
محبت سے پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا......

☆

پرندوں کے پر اپنی ڈوری سے باندھو

نئی صبح کے اس گریباں سے کہہ دو
اجالوں میں بھیگی یہ زرتار کرنیں
شفق دو شفق پر ازل سے ملی ہیں
چلا آرہا ہے انھی کا تسلسل
زمانوں، قِرانوں میں جتنے بھی پل ہیں
حسیں وادیوں میں چھپے جتنے بَل ہیں
انھی کی غزل ہیں
رمیدہ وہ آہو
پریدہ پرندے
جو شاعر کے سینے میں بَل کھا رہے ہیں

گریبان والو!
پرندوں کے پر اپنی ڈوری سے باندھو

☆

محبت سے زرا پہلے

سہانے وقت ٹھہرو تم
مری اک بات سن جاؤ
تمھاری دلکشی، یہ سرسراہٹ اور خاموشی
حسیں پیکر، اچھوتی دھند، اک اجلا پہر
اس پر
دریچوں سے لپکتی روشنی جس میں
ہزاروں نور کے ذرّے مسلسل رقص میں ہیں
محبت سے زرا پہلے کا منظر ہے

وہ ساری روشنی جو میرے آنگن میں تم اپنے ساتھ لاؤ گے

مرے من میں کہیں سہمی پڑی ہے
زرا آؤ
اسے بیدار کر ڈالو، مجھے سرشار کر ڈالو
گریزاں ہو نہ جانے کیوں؟
سہانے وقت ٹھہرو تم!

☆

دعا

جو ستارے چمکدار آنکھوں میں ہیں
وہ دمکتے رہیں
جو اجالا ترے پھول ہونٹوں میں ہے
وہ بکھرتا رہے
کہکشائیں کہ جو تیرے کانوں میں ہیں
وہ سنورتی رہیں
موج، خوشبو کی جو تیرے گلشن میں ہے
وہ مہکتی رہے
تیرے آنچل کے موتی چمکتے رہیں
تیری افشاں کی کرنیں لپکتی رہیں

خواب آنکھوں پہ تیری اترتے رہیں
لفظ، ہونٹوں پہ تیرے مہکتے رہیں

خالِ رخ کی پھبن
ہاتھ کنگن کی چھن
تیرے من کی لگن

ہو کبھی بھی نہ کم
تو سدا زندگی کا سہارا رہے

٣

ہالینڈ

(تارکین وطن کا المیہ)

شب و روز کے سلسلے جو محبت کی خوشبو سے مہکے ہوئے تھے
ضرورت کی زد پر جب آئے
تو پانی کا پہنا ہوا پیرہن بھی سفینوں کو سونپا
اور اجلے سمندر بھی نہروں میں بدلے
یہ بگلوں سے پوچھو
کہ کن آبناؤں کے پانی تھے گدلے
جو مٹی سے اٹھ کر
بہے، اُس بہاؤ میں
جو سمت رکھتا نہیں تھا

وہ بگلے تھے پگلے
وہ عمروں کے حاصل ، وہ رشتوں کی گرھیں
زمینوں کے ناتے ، ستاروں سے باتیں
وہ سب اب کہاں ہیں
کہاں ہیں وہ گم گشتہ اجلے مسافر
غلط فہمیوں کے سفر پر چلے تھے خزانوں کے جویا
خزانے لٹانے

☆

جنیوا

(کوئی مسافر کسی پرندے سے)

ادھر آؤ کہاں گم ہو
کہ ان شاخوں میں وہ کچھ ہے
جسے تم ڈھونڈتے ہو آسمانوں میں زمینوں میں
سحر، جب منہ اندھیرے آنکھ ملتی ہے
تو دھر دیتی ہے شانوں پر تمھارے
گٹھریاں کہنہ فرائض کی
کہ جن کے میل سے ننھا سا دل آزردہ ہو جائے
نکلتے ہو کسی ایسی زمیں کی سمت جو پہلے نہیں دیکھی
وہ نادیدہ سمندر ہے

نہنگوں کے نشیمن ہیں کہ موتی سیپ میں خوابیدہ......؟
جانے کیا ہے کیسا ہے؟
ادھر مغرب میں مشرق کا مسافر دن ڈھلے پہنچا
تمھارے دل میں اپنے آشیاں کی یاد ابھر آئی
سنو ٹھہرو تمھارا آشیاں میں ہوں
رکو، بیٹھو مری شاخوں وہ کچھ ہے
کہ جس کی جستجو تم کو لیے پھرتی ہے دنیا میں
تم اپنے دل کے طائر کا کہا مانو
یہیں آسودگی ہے آؤ یہ آسودگی پاؤ

☆

ماریشس

(بحر ہند کے خوبصورت جزیرے کے نام)

اداس سینوں میں غم بھرا تھا
سفینے نادیدہ منزلوں کو لپک رہے تھے
وہ خواب تھے جو لباس بن کر اتر گئے تھے
جو، ان کی دھرتی تھی خاک بن کر سیاہ بادل میں بس گئی تھی
سفر کی تاریک رات آنکھوں کی روشنی کو بجھا رہی تھی
نجانے کس سمت قافلے یہ رواں دواں تھے
سیاہ باطن، سفید آقا
اجل بنے تھے
کسے خبر تھی کہ کون کیا ہے
بس اک جزیرے کا خواب سونا بنا ہوا تھا

شکر کا اور نیشکر کا سونا
کسے خبر تھی کہ خواب تو سب بکھر چکے ہیں
کہاں ہے بیٹا کہاں ہے بھائی؟
حنائی ہاتھوں میں ایسے پیچوں نے راہ پائی
کہ بن بیاہے سہاگ اجڑے
جواں نگاہوں نے پیری دیکھی
پلٹ کے پھر وہ کبھی نہ آئے
اس اک نئے دیس کی بنا میں
سفید آقاؤں کی ہوس نے
سبھی کو بھرتی بنا دیا تھا......

☆

نیپلز

دور تک اس گلی کے پچھواڑے
وقت   بہروپ بھرتا رہتا ہے
زندگی اور شباب کی موجیں
اس کی لہروں سے یوں الجھتی ہیں
اشک سوکھے ہوئے سمندر میں
جیسے پتوار کے بغیر چلے
ناؤ چلتی ہے اشک بہتے ہیں
لوگ پھر نیپلی ☆ میں رہتے ہیں

☆ نیپلی = اٹلی کے شہر نیپلز کا عوامی نام

اٹلی

قیصر روم ترے دیس میں ہوں
شاہراہیں کہ جنھیں دیکھ کے دل ہل جائے
تیرا وہ شوق بھڑا دے جو درندوں سے بھی انسانوں کو
ایسی تمثالیں کہ بس بول ہی اٹھیں گویا
ایسے ساونت کھڑے ہیں جو عمارات اٹھائے سر پر
پانیوں میں وہ روانی جو نہیں جینے میں
اک مسافر تجھے ان سارے مظاہر میں کہیں ڈھونڈتا ہے
تو کہاں گم ہے، کبھی آ کے یہ آواز تو سن

☆

یورپ

سفر ایسا
کہ جس میں راستوں کی دھول سے بنتے بگڑتے دائروں میں
صورتیں ابھریں
لب و رخسار جن پر وقت کی تہ ہو
وہ آنکھیں منظروں کی گرد سے جو کم دکھائی دیں
جبینیں، جن پہ گرھیں ہوں
نہ کوئی تابنا کی اور نہ رنگ و روپ کی رونق
وہی آنکھوں میں چبھتی ہوں
وہی دل میں مہکتی ہوں
سمندر پار جانے والے جن آنکھوں کی جھیلوں میں اترتے ہیں

وہ جھیلیں کب جھیلے ہیں
یہ جھیلیں ایک دن باہر نکالیں گی
سبھی ڈوبے ہوؤں، بھولے ہوؤں، بہکے ہوؤں کو
وہ ساری تابنا کی جو مناظر میں دمکتی ہے
بدن تک ساتھ دیتی ہے
کسی دل تک نہیں جاتی

☆

یونان

جھوٹ کے جام چل رہے تھے جب
میں نے سچائی کا پیالہ بھرا
اور سقراط کو تلاش کیا
کاش سقراط مجھ کو مل جائے
میرے دل کا کنول بھی کھل جائے
وہ فلاطوں جو آخری لمحے
اپنے استاد تک نہیں پہنچا
میں جہاں بھی گیا میسر تھا
رخش، ظلمت میں گم، فگندہ سُم

جستجو کے اسی تسلسل میں
شہرِ یونان تک چلا آیا
ہائے سقراط تو یہاں بھی نہیں
اس کا کوئی یہاں نشاں بھی نہیں
اب میں سقراط کو کہاں ڈھونڈوں......

☆

استنبول

وہ عمارات کہ روشن ہیں جبینیں جن کی
آرزومند ہیں کھولے کوئی
ان کے ماتھے کی گرہ
کوئی تو ہو......
انھیں بوسہ دے لے
دیکھنے والے تو آئے پہ خزانے کا نہیں راز کھلا
کاش اب دستِ صبا ان کی مہک پھیلائے

☆

قونیہ

قونیہ اک چراغ ہے گویا
جس کی لو رات دن چمکتی ہے
روشنی دور تک پہنچتی ہے
خون جب معجزے دکھاتا ہے
قونیہ دیو ودد کے ریوڑ میں
ایک انسان ڈھونڈ لاتا ہے
ایک انسان جس کی آنکھوں میں
سب زمانے ہیں سب زمینیں ہیں
اس کے قدموں تلے
زمینوں میں

کیسے اجڑے ہوئے دفینے ہیں
قونیہ کچھ بتا چراغ تلے
کیا سبب ہے کہ گھپ اندھیرا ہے......؟

☆

ایران کی پہلی نظم

اگر سردی نے
سب کچھ سرد کرڈالا ہو
اس کی لہر باطن تک سرایت کر چکی ہو
پھول کھلتے ہوں نہ کوئی شاخ ہلتی ہو
چمن کے چہچہے خاموش ہوں
اور آبشاروں کے اچھلتے پانیوں میں
زندگی کی لہر جمتی جا رہی ہو
سخن میں ساز ہو کوئی نہ خوابوں میں کوئی خوشبو
اچانک اک دریچہ آسماں سے صبح کا پیغام لے آئے
سخن میں ساز اور خوابوں کی خوشبو

لوٹ آئے

رُکے پانی رواں ہوں

زمزمے، منقار سے پھوٹیں

کرن، پھولوں میں ڈھل کر

شاخچوں پر رقص کرتی ہو

چمن معمور ہو جائے

حرارت سے

محبت سے

بہت مشکل سہی لیکن

کسی دن ہو تو سکتا ہے ....

☆

اختتامیہ

خزاں کی یخ بستگی میں پھولوں کی مسکراہٹ

جناب جمیل یوسف

جناب زاہد منیر عامر کی نظمیں عصر حاضر کے انسان کے شعور و احساس کا آئینہ ہیں جس میں اس کی روزمرہ زندگی کے شب و روز جھلکتے ہیں۔ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں اسے اپنے وجود کی بے بسی اور فنا پذیری کا احساس ستاتا ہے۔ اس کا خوبصورت شاعرانہ اظہار ''ایکوریم'' میں ملتا ہے:

''میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا
میں پانی میں ہوں
اور کچھ بلبلے میرے جینے کا سامان ہیں''

یہاں میر کے اس شعر کا خیال آتا ہے ۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا — آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا

مگر بات آگے بڑھتی ہے، زاہد منیر شاعر کہتے ہیں:

''مرے سامنے وسعتیں بیکراں ہیں

رنارسائی ہے حد نظر تک
میں شیشے کی دیوار میں قید ہوں اور
انہی پتھروں میں مجھے ڈھونڈتا ہے
وہ نغمہ کہ جس سے رواں ہے یہ پانی
مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے''۔

یہی انسان کا المیہ ہے اور یہی اس کا مقدر ہے۔ اس کی نظم ''آنکھوں میں چھپے موتی'' انسان کی بے بسی اور نارسائی کی ایک اور تصویر سامنے لاتی ہے:

آنکھوں میں چھپے لفظوں
ان میں چھپے لیکھوں!
سینوں میں دبے جذبوں کو
کس نے یہاں سمجھا......
ہر ایک کی دنیا کے کچھ اپنے مسائل ہیں
جب وقت مہکتا ہے
ہر شاخ پہ شادابی
مستی میں لہکتی ہے
جب وقت نمو بن کر
شاخوں سے ٹپکتا ہے
وقت بھی دنیا کو
اس حسن سے ملنے کی
فرصت ہی نہیں ملتی......
ساحل سے سفینوں کو
ملتا ہے اشارا جب
آنکھوں میں چھپے موتی
کرتے ہیں کنارا جب

ہر رنگ بدلتا ہے
کہنے کو تو کہتے ہیں
اے کاش نہ تم جاتے
لیکن کسے فرصت ہے
رک کر وہ ہمیں تھامے
اور کون ہے جو روکے......
ہر ایک کی دنیا کے
کچھ اپنے مسائل ہیں''۔

مگر زاہد منیر عامر رجائیت اور امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انسان کی تمام نارسائیوں کے باوجود اور خزاں کی تمام تباہ کاریوں اور یخ بستگی کے باوجود وہ مایوسی یا ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ بہار کی آمد کا مژدہ جاں فزا سناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خزاں کی یخ بستگی اور پھر بہار میں پھولوں کی مسکراہٹ، شاعری میں ڈھل کر استعاراتی روپ دھار لیتے ہیں۔ جس طرح ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے:

If winter comes, Can spring be far behind

اس ضمن میں زاہد منیر عامر کی نظم ''ایران کی پہلی نظم'' ملاحظہ ہو:

''اگر سردی نے سب کچھ سرد کر ڈالا ہو
اس کی لہر باطن تک سرایت کر چکی ہو
پھول کھلتے ہوں، نہ کوئی شاخ ہلتی ہو
چمن کے چہچہے خاموش ہوں
اور آبشاروں کے ابلتے پانیوں میں
زندگی کی لہر جمتی جا رہی ہو
سخن میں ساز ہو کوئی
نہ خوابوں میں کوئی خوشبو
اچانک اک دریچہ آسماں سے صبح کا پیغام لے آئے

سخن میں ساز اور خوابوں میں خوشبو لوٹ آئے......

رُکے پانی رواں ہوں
زمزمے منقار سے پھوٹیں
کرن، پھولوں میں ڈھل کر
شاخچوں پر رقص کرتی ہو
چمن معمور ہو جائے
حرارت سے
محبت سے
بہت مشکل سہی لیکن
کسی دن ہو تو سکتا ہے''۔

اب محترم جناب ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے بارے میں ایک نہایت خوبصورت نظم ''سے کا پارکھ'' دیکھیں:

گزرتے وقت! اس کی مانگ میں عمر گریزاں کا نہ کوئی رنگ بھرتا
چمکتی، وقت کے اُس پار تکتی، دُوررَس آنکھوں کے روشن آئینے میں
بال مت لانا
......زمانے کی سماعت کو
جو کومل سُر میسر ہے
اسے مت چھیننا

....

کہانی کا ہر اک کردار
اپنا راز اس پر کھولتا ہے
زمانے سُن!
ابھی وہ بولتا ہے''۔

اپنے ایک اور استاد محترم جناب پروفیسر چودھری عبدالحمید صاحب کو مخاطب کرتے

ہوئے اپنی نظم ''کرن، خاک اور خواب'' میں لکھتے ہیں:

تمھارے شب و روز تو خارزاروں میں بیتے
مگر تم مہکتے گلابوں کی دُھن میں
انہی خارزاروں میں خوشیاں اگاتے رہے
تمھیں تھے
جسے خاک آلودہ کرنوں سے اتنا شغف تھا
کہ کرنوں کو سورج بنانے کی دُھن تھی
کہ تم خود کرن تھے
چمکتی ہوئی اور مہکتی کرن تھے
تمھاری کرن، خاک سے خواب تک کا سفر کر رہی تھی
ابھی میرے سینے میں زندہ ہیں وہ لفظ
جن کی حرارت
تمھاری نگاہوں میں لو دے رہی تھی''۔

علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال پر کئی اشعار لکھے ہیں بلکہ ایک پوری کتاب ''جاوید نامہ'' جس کو وہ اپنی شاعری کا شہکار سمجھتے تھے، کا نام ہی اپنے بیٹے کے نام پر رکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے ان کے دل میں کیا کیا آرزوئیں تھیں، کیا کیا تمنائیں تھیں۔ ہر محبت کرنے والے باپ کے دل میں اپنے بچوں، خاص کر کسی ایک بچے کے لیے ایسے ہی خواب ہوتے ہیں....شاذ و نادر ہی وہ خواب پورے ہوتے ہیں۔ سوائے ڈاکٹر جاوید اقبال کے، شاعروں کے بیٹے تو علم و دانش میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے، بلکہ عموماً گمنام ہی گزر گئے ہیں۔ جاوید اقبال ایک ایسی استثنائی شخصیت تھے جس کی مثال نہیں ملتی۔

جناب زاہد منیر عامر کے سارے بچے ماشاء اللہ غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع ہیں مگر خصوصی طور پر ان کا بیٹا سروش اور بیٹی ندیا حیران کن حد تک لائق اور ذہین ہیں۔ ابھی اسکول کے درجوں میں ہیں مگر ان کی تخلیقی اور تصنیفی اُپج کا اظہار ہو رہا ہے۔ زاہد منیر عامر

صاحب نے سروش پر جو نظم لکھی ہے وہ علامہ اقبال کے جاوید اقبال کے بارے میں اشعار سے بڑھ کر شاعرانہ اظہار اپنے اندر رکھتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

تمھارے لہجے میں گنگناتے ہیں وہ زمانے
جو آنے والے دنوں میں گم ہیں
چمکتی آنکھوں کے دائروں میں
کرن ہے، جس میں نیا زمانہ دمک رہا ہے
کھنکتے لفظوں میں صبحِ فردا کی آہٹیں ہیں
مری بصارت، مری سماعت
رُواں رُواں ڈوبتے بدن کا
اسی زمانے کا منتظر ہے
کہ جب تمھارا وجود ہو ایک استعارہ
حیات افروز روشنی کا"۔

شاعر کو کبھی وہ دن یاد آتے ہیں جب محبت کا جذبہ پہلی دفعہ اس کے دل میں بیدار ہوا تھا اور زمین و آسمان کے منظروں پر ایک نئی روشنی کی چھوٹ پڑی تھی۔ یہ ایک نئی آگہی تھی جس سے شاعر کا وجود پہلی دفعہ آشنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی عنفوانِ شباب کا لمحہ شاعر کو یاد کے دریچوں سے پھر اپنی جھلک دکھاتا ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

یہی دن تھے کہ سینے میں کوئی شے کسمساتی تھی
یہی دن، آسمانوں سے ستاروں کے اترنے کے
یہی دن چاند کو دن رات ان آنکھوں میں بھرنے کے
یہی دن روشنی میں شمعِ جاں کو آزمانے کے
یہی دن لفظ کو جذبے کی خلعت سے سجانے کے
یہی دن روٹھ جانے کے
یہی دن مان جانے کے
یہی دن تھے کہ خود کو اپنے گنبد سے نکالا تھا

شفق پھوٹی، سحر آئی کسی پنچھی نے پر کھولے
نگہ اٹھی، قدم لرزے، یکا یک آسماں ڈولے
سماعت نے ہر اک آواز میں امرت کا رس پایا
نگاہوں میں زمین و آسماں کا حسن لہرایا
زمانہ نور میں ڈوبا، تمنا کا فسوں جاگا
یہی دن تھے کہ ہر جانب تمنا رقص کرتی تھی
ہواؤں نے سمندر کے اچھلنے کی بشارت دی
سمندر نے صدف کی مانگ بھرنے کی بشارت دی
لہکتی ڈال ہاتھوں میں مہکتے پھول لے آئی
ہوا خوشبو میں، خوشبو آرزوؤں میں سمٹ آئی
مری آنکھوں میں اوّل اوّل اشکوں کی گھٹا چھائی
یہی دن تھے''۔

اوپر کی نظم میں جس نئے نویلے جذبے کا اظہار ہے وہی کنوارا جذبہ کروٹیں لیتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ''محبت امتحاں ہے'' میں نئے مرحلہ ہائے شوق طے کرتا ہے:

ذرا دیکھ گزرتے روز و شب کو
ہر اک لمحہ ستارا ہے
اگر تسخیر ہو جائے تو یہ لمحہ تمھارا ہے
تمھارے خوبصورت ہاتھ میں
سورج کی کرنوں میں
تمناؤں کی خوشبو سے مہکتی
چاندراتوں میں
ستارے ہی ستارے ہیں
انھیں تسخیر کر لو تو تمھاری مانگ میں یہ سب ستارے جگمگائیں گے
ستارے اور آئیں گے

فلک بھی اور آئیں گے
اگر تم روشنی سے دوستی کر لو
تو یہ جانو کہ ہر لمحہ محبت کا نشاں ہے
محبت امتحاں ہے"۔

اب محبت کا سفر نئے عزم اور نئے ولولے سے جاری ہے۔ "محبت آزمائیں گے" میں:

"نہیں!
اب ہم، نہیں روٹھے گے
اب ہم آسمانوں سے اترتے پیار کے پیغام کا رستہ نہ روکیں گے
نہیں، ہم
شاخچوں پر کوکتی کوئل کے نغموں کو سنیں گے
پھول کے دل میں اترتی
لمحہ لمحہ ڈوبتی منقار دیکھیں گے
سحر دم ہر رخِ زیبا پہ لکھی آس اور امید کی تحریر پڑھ لیں گے
ستاروں کے سفر میں چاند کی منزل کو پائیں گے
محبت آزمائیں گے
چلو! نازک لبوں سے پھوٹتی کلیوں کی اک مالا بنائیں
اور اسے زیب گلو کر لیں
نگاہوں میں اترتے ساونوں سے ہم نئے منظر بنائیں گے
نئی دنیا بسائیں گے
محبت آزمائیں گے"۔

اب شاعر اپنے محبوب سے ایک نئے زاویے سے مخاطب ہوتا ہے۔ "نظم تم سے کلام کرتی ہے":

نظم تم سے کلام کرتی ہے
آسمانوں کے نور و نکہت میں

خوشبوؤں کی حسیں رنگت میں
لفظ و معنی، اٹوٹ سنگت میں
نظم کے تانے بانے بنتے ہیں
میٹھی یادوں کے پھول چنتے ہیں
نظم تم سے کلام کرتی ہے
صبح کے سیمگوں اجالے میں
روشنی کے لطیف ہالے میں............
چار موسم جو یہ ہمارے ہیں
یہ عناصر کے استعارے ہیں
رنگ جتنے ہیں، سب تمھارے ہیں
یاد، لفظوں میں رنگ بھرتی ہے
نظم تم سے کلام کرتی ہے''۔

اب شاعر والہانہ محبت کی راہوں پر گامزن ہے اور اس کی کیفیت وہی ہے جو فیض نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے　　　آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

نظم ملاحظہ ہو ''ترا عکس آئینوں میں'':

یہ وہ تجربہ ہے جس میں
کوئی حد نہیں مکاں کی
مرے بحر بیکراں کی
جو ازل سے بہہ رہا ہے
سر ساحل زمانہ
یہ جو رنگ روپ چہرے
مرے ہر طرف سجے ہیں
یہ تمام آئینے ہیں

ترے عکس دل نشیں کے
یہ جو پھول سے گزر کر
مری روح میں سمائی
یہی خوشبوئے فروزاں
مجھے جگمگا رہی ہے
وہ کلی جو کھل گئی ہے
دبے پاؤں اس روش پر
سرِ راہ بچھ گئی ہے
تری یاد آ رہی ہے"۔

اوراب اپنی محبوبہ کے لیے شاعر کی دعا:

"جو ستارے چمکدار آنکھوں میں ہیں
وہ دمکتے رہیں
جو اجالا ترے پھول ہونٹوں پہ ہے
وہ نکھرتا رہے
کہکشائیں کہ جو تیرے گالوں میں ہیں
وہ سنورتی رہیں
موج ،خوشبو کی جو تیرے گلشن میں ہے
وہ مہکتی رہے
تیرے آنچل کے موتی چمکتے رہیں
تیری افشاں کی کرنیں لپکتی رہیں
خواب، آنکھوں پہ تیری اترتے رہیں
لفظ ہونٹوں پہ تیرے مہکتے رہیں
خالِ رُخ کی چبھن
ہاتھ کنگن کی چھن

تیرے من کی لگن
ہو کبھی بھی نہ کم
تو سدا زندگی کا سہارا ہے''۔

میرا ایک شعر ہے:

ہمارے عہد محبت سے کیا رہا باقی　　اداس کرنے کو بس ایک نام باقی ہے

یہ شعر مجھے زاہد منیر عامر صاحب کی نظم ''اداسی کو بہانہ مل گیا ہے'' پڑھ کر بے ساختہ یاد آ گیا۔ ان کی نظم دیکھیں، بہت عمدہ نظم ہے:

اداسی یوں تو اس دھرتی کی مٹی میں گندھی تھی
گھنے اشجار سے پتوں کی صورت پھوٹتی تھی
فضا میں نیم سرگوشی کی آوازوں میں ڈھل کر
اداسی کی خنک لہریں رگِ جاں میں سرایت کرتی جاتی تھی
سمندر سے اداسی، ڈولتی
بل کھاتی، ساحل سے گریزاں
جب کبھی لنگر اٹھاتی تھی
چمکتے موتیوں کے ہار اپنے ہاتھ میں لے کر
اسی دھرتی کی جانب لوٹ آتی تھی
یہ سب کچھ تھا
مگر تب تک تمھیں دیکھا نہیں تھا
تمھیں دیکھا، تمھاری یاد کے غُنچے کھلے اور پھر
گھنے اشجار پر
دھرتی کے شرق و غرب میں پھیلی
ترنم آمیز آوازوں
فضاؤں اور ہواؤں میں
چمکتی قوس میں

اور آسمانوں سے اترتے موتیوں کی آبشاروں میں
سرِ ساحل، سرِ صحرا اُداسی ہی اُداسی ہے
اُداسی کو بہانہ مل گیا ہے''۔

اب آگے میرے سامنے ایک بڑی خوبصورت نظم ہے ''ستارے میرے مونس ہیں''۔ اس میں سے ایک اقتباس:

ستارے میرے مونس ہیں
بہت تاریک راتوں میں مرے ہمراہ چلتے ہیں
مری افسردگی کو دیکھ کر
افسردہ ہوتے ہیں
مجھے جب قعرِ غم میں ڈوبتا دیکھیں
تو مجھ پر مسکراتے ہیں
مجھے باہر بلاتے ہیں
اندھیرے لاکھ ہوں لیکن
ستارے جگمگاتے ہیں
مجھے رستہ دکھاتے ہیں''۔

اور اب ایک اور بہت اچھی نظم، بڑا خوبصورت شاعرانہ اظہار، نظم کا عنوان ہے ''کہاں ہو تم'':

''کہاں ہو تم
تمھاری کچھ خبر آتی نہیں ہے
سنا یہ تھا
بلندی پر پہنچ کر سب نظر آتا ہے لیکن
تمھاری صورتِ زیبا نظر آتی نہیں ہے
نہ وہ آواز ہے جس کی نشیلی گنگناتی آہٹوں میں
پھول کھلتے ہیں
اجالے، مجھ سے ملتے ہیں

نہ وہ رفتار جو کلکِ قدم سے
اک پیامِ آسمانی کو
زمینی زائچوں میں نقش کرتی ہے
صبا جس سے بہت بچ بچ کے چلتی ہے"۔

زندگی کا ایک اور رُخ۔ ایک اور تلخ حقیقت:

مجھے جلدی بہت تھی
اس لیے
جملے بھٹکتے تھے
بہت سے لفظ باتوں میں
نشست اپنی بدلتے تھے
بہت سرگوشیاں
میری سماعت پر اترتی تھیں
سماعت سے ذرا آگے مگر جلدی کا پہرا تھا
میں سنتا تھا پہ بہرا تھا
سرِ رہ ریختہ پتوں کو سننے
پھول چننے
یا نشیلے بادلوں کو دیکھنے کی بھی، ذرا فرصت نہیں تھی
مجھے جلدی بہت تھی"۔

اب ہم زاہد منیر عامر کی ایک اور نظم پڑھتے ہیں۔ "حقیقت واہمہ ہے":

حقیقت، آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے
ہماری آرزوئیں بھی
فقط صحرا کے چشمے ہیں
کسی چہرے کی زیبائی
کوئی رفعت، کوئی عظمت

کوئی دانائی، رسوائی، یہ سب اک کینوس پر
جا بجا رنگوں کے دھوکے ہیں
اگر رنگوں کو ہم چھو لیں
تو یہ سب نقش مٹ جائیں
حقیقت واہمہ ہے
آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے''۔

نظم ''لرزتی لہروں کا خاموش فیصلہ'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ روزمرہ زندگی کی ایک جانی پہچانی اہم حقیقت کا خوبصورت شاعرانہ اظہار ہے۔

''بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے
ابھی تو موسموں کی ڈالیوں پر پھول کھلنا تھے
ابھی تو ابر کو چاروں طرف سے گھر کے آنا تھا
ابھی کچھ حرف تھے جو لفظ کی صورت کو تکتے تھے
ابھی تو عمر کے بادل سرِ صحرا چمکتے تھے
یہ تم نے کیا کیا
جلدی میں ایسا فیصلہ......اور یوں
چراغ دل کی لو اس فیصلے سے ڈگمگائی ہے
چمکتی صبح کی کلیوں پہ کیسی رات چھائی ہے
وہ دھرتی مدتوں جو قطرہ شبنم کو ترسی ہے
تمھارے فیصلے نے کس طرح سیراب کر ڈالی
ذرا دیکھو محبت کس طرح آنکھوں پہ برسی ہے
محبت کا تقاضا تھا کہ تم کچھ دن ٹھہر جاتے
وہ دن جن پر تمھارے پیار کے کچھ حرف اُترے تھے
وہ ان سے سائباں بن کر
زمانے کی چمکتی دھوپ میں کچھ دن اماں پاتے

مگر تم کو تو جلدی تھی
تمھارے سانس کی لہریں لرزتی تھیں
محبت کو نگاہوں میں تڑپتا چھوڑ کر
تم نے یہ کیسا گھر بسایا ہے
یہ وہ منزل ہے جس میں کوئی اپنا نے پرایا ہے
بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے''۔

حفیظ جالندھری کا شعر ہے:

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والے ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

اس دیوانگی کا علاج شاعر نے اپنی نظم ''ابھی کچھ کام باقی ہیں'' سے کیا ہے:

ابھی کچھ کام باقی ہیں
کتابوں سے گزر کر دل میں جا بیٹھا ہے جو
وہ نام مٹنا ہے
کسی گنجینۂ امروز کو
ماضی کا پیراہن پہننا ہے
ابھی پھولوں سے اور پھولوں کی خوشبو سے
مجھے آگے گزرنا ہے
لکیروں میں ابھرتی صورتوں کو محو کرنا ہے
تمنا کی جہانگیری بہت دن دیکھ لی میں نے
حقیقت کو
تمنا کے سرابوں سے
بس اب آزاد کرنا ہے''۔

مولانا رومیؒ نے کہا تھا:

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما ‏‏‏‏ اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما ‏‏‏‏ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

مولانا رومی کے مندرجہ بالا اشعار مجھے زاہد منیر عامر صاحب کی نظم ''محبت! شکریہ تیرا'' نے یاد دلا دیے ہیں:

میں اک تنہا شجر
سورج کی حدت میں پگھلتا تھا
گزرتے وقت میں گرہوں پہ گرہیں پڑتی جاتی تھیں
کوئی بادل مرے آکاش پر کم ہی اترتا تھا
پھر اک دن یوں ہوا
بادل نے مجھ سے دوستی کر لی
مرے آکاش پر اترا
مجھے دیکھا
مجھے سرشار کر ڈالا
مری سوچوں میں رعنائی
سماعت پر مری دستک
مری آنکھوں میں خواب اترے
محبت! شکریہ تیرا''۔

اور اب ایک اور نظم پڑھ کر مجھے کسی شاعر کا یہ مصرعہ یاد آ گیا ہے:

ہیچ عاشق سخنِ تلخ بہ معشوق نہ گفت

نظم ہے ''نہیں ایسا نہیں کہتے''

''نہیں ایسا نہیں کہتے
ستارے، آسماں کی وسعتوں کو زیب دیتے ہیں
مہکتے پھول اپنی ڈالیوں پر اچھے لگتے ہیں
سہانے دِن تمازت سے چمکتے ہیں
وہ جس سے اپنے دل کے آستانے کو سجاؤ تم
جسے اپنا بناؤ تم

اسے پھر آسمانوں کی بلندی پر بٹھا تم
مگر ایسا نہ ہو اس کو گراؤ تم
تمھیں معلوم ہے جب روشنی نیچے اترتی ہے
سوا نیزے پہ ہوتی ہے
قیامت ساتھ لاتی ہے
نہیں ایسا نہیں کرتے
نہیں ایسا نہیں کہتے''۔

''محبت سے پہلے'' بھی اسی سلسلے کی نظم ہے اور خوب ہے:

محبت سے پہلے
کسی روپ میں دِل کشی نے بسیرا کیا ہی نہیں تھا
چمکتی نگاہوں سے اس آئنے پر
کرن کوئی اتری نہیں تھی
جہاں اب ستاروں کے جھرمٹ سجے ہیں
کسی زلف کے بل میں دل کے الجھنے کا
امکان کب تھا......
محبت سے پہلے
محبت سے پہلے یہی پھول تھے
ان میں خوشبو نہیں تھی
یہی چاند تھا
چاندنی کب تھی اس میں
ستاروں میں ٹکڑے نہ تھے میرے دل کے
مرے شہر کے موسموں میں تھی شدت
مگر ان میں کوئی حرارت نہیں تھی
حرارت نہیں تھی

محبت نہیں تھی
نئے دن تو آتے تھے لیکن
نئی بات ان میں کہاں تھی
مگر اب جہاں تک نظر ہے نئے راستے ہیں
نئی زندگی اور نئے روز و شب ہیں
نئے سلسلوں میں بجی ہیں بہاریں
دنوں میں ہے ساون
تو راتوں میں شبنم
کھنکتا ہے لہجہ
چمکتے ہیں لمحے
محبت سے پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا"۔

جمیل یوسف

معانی کے پریدہ پرندے اور خوش ادالفظوں کی ڈوریاں

جناب ڈاکٹر سعادت سعید

شاعر اگر زندگی، انسان اور کائنات کے رمز شناس نہ ہوں تو ان کی شاعری اس ارفع مقصد سے کنارہ کش رہے گی جس کا لب لباب انسانی اشرفیت کی نشاندہی ہے۔شاعروں کے مشاہدے ان کی باطنی لگن کی روشنی میں معانی کی آئینہ بندی کرتے ہیں۔ان کے سینے ایسی آگ سے منور ہوتے ہیں جو خام کو پختہ کرتی ہے۔نثر جس منطقیت کی طالب ہوتی ہے شاعر اس کے خلاف اپنا حسن تعلیلی وسیلہ استعمال کرتے ہیں یوں ان کے حرارت اور تڑپ سے معمور خیالات جب صفحہ قرطاس کی زینت بنتے ہیں تو ان کے عام مشاہدوں، اور تجربوں کی قلب ماہیت ہو چکی ہوتی ہے۔شاعروں نے فی الحقیقت افادی نحویت اور روایتی صرفیت کے سلسلوں کو ترک کرنا ہوتا ہے اسی لیے وہ مشاہدہ حق کی گفتگو کرنے کے یا بنانے کے لیے بادہ و ساغر کی جانب توجہ دیتے ہیں۔ تب ان کی شاعری اپنے بلند و پست معیار کے مطابق قارئین سے ہمکلام ہوتی ہے۔شاعر ماورائی نور و نکہت، رنگین خوشبوؤں کے سنگ جب اپنے ماضی کے پاتالوں میں اترتا ہے تو پھر اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے الفاظ کسی نظم میں ڈھل کر اس سے گفتگو کریں۔یوں شاعر کی خود کلامیاں ہم کلامیوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔شاعر

کھلی آنکھوں سے صبح کے بے کراں اجالے اور روشنی کے لطیف ہالے دیکھتا ہے۔درختوں، پودوں، پھولوں کے رنگوں سے آشنا ہوتا ہے۔اسے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے سلسلوں سے آگہی ہے۔وہ ان مجازی سلسلوں کو حقیقی حوالوں سے دیکھتے ہوئے ان کے رنگوں کو کسی کا عکس یا عطا سمجھ لیتا ہے۔یوں استعاراتی اور علامتی اظہار کے در وا ہو جاتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی نظم ایکوریم ملاحظہ ہو:

میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا
میں پانی میں ہوں اور کچھ بلبلے میرے جینے کا سامان ہیں
میں خود آبلہ ہوں
مجھے ٹھیس پہنچے ذرا سی بھی کوئی
مرے روز و شب ریزہ ریزہ بکھر جائیں گے
اور میں پھر سے پانی میں بہنے لگوں گا
مرے سامنے وسعتیں بیکراں ہیں
مگر بے کرانی ہے حد نظر تک
میں شیشے کی دیوار میں قید ہوں اور
یہی آب و گل ہے
یہی سبزہ و گل
انھی پتھروں میں مجھے ڈھونڈنا ہے
وہ نغمہ کہ جس سے رواں ہے یہ پانی
مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے

زاہد منیر عامر نے ایک حساس شاعر کی مانند ایکوریم میں قید سمندری حیات کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسے اپنی حیات کے قید خانے سے ملا دیا ہے۔اس وجودی رویئے سے ان کی نظموں کے استعاراتی معنی توسیع پاتے ہیں۔

زاہد منیر عامر جب چار موسموں کو عناصر کے استعارے قرار دیتے ہیں تو وہ سائنسی

منطق، لیوی سٹراسی اسطوری جبر اور یاک ڈریڈائی فکری درفنطیوں سے ماورا تلمیذ الرحمنی سلسلوں کا اثبات کرتے ہوئے شاعری کو جزویست از پیغمبری سمجھتے ہیں۔زاہد منیر عامر کی نظمیں ان کے اسفار کی یاد بھی دلاتی ہیں، ان کے جمالیاتی تجربوں کی نشاندہی بھی کرتی ہیں اور ان کی انسانی عقیدتوں سے مملو سوچ کی عکاس بھی ہیں۔یہ ان کی متخیلہ اور فینسی آشنا حسیت ہی کا کمال ہے کہ جس کی مدد سے وہ اپنی نظمیہ کمپوزیشنز کو ایجازی تاثیر سے معمور کر دیتے ہیں۔ان کی شاعری حیات جوئی اور روشنی طلبی کی متنوع سمتوں کو محیط قارئین کو باور کرواتی ہے کہ شاعر عصری بوالعجبیوں کے خلاف بھرپور احتجاج کرنے کا اہل ہوتا ہے۔اپنی نظم کرن، خاک اور خواب میں وہ اپنے ممدوح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

محبت کے جو لفظ
دل میں تمھارے ادھورے پڑے تھے
تمھارے عمل نے وہ روشن کیے
اُن کو پورا کیا............
تمھارے شب و روز تو خارزاروں میں بیتے
مگر تم مہکتے گلابوں کی دھن میں
انھی خارزاروں میں خوشیاں اگاتے رہے......
تمھی تھے، جسے خاک آلودہ کرنوں سے اتنا شغف تھا
کہ کرنوں کو سورج بنانے کی دھن تھی
کہ تم خود کرن تھے
چمکتی ہوئی اور مہکتی کرن تھے
مگر ایک گدڑی میں لپٹی کرن تھے
یہ گدڑی بھی مٹی میں رکھ دی گئی ہے
تمھاری کرن خاک سے خواب تک کا سفر کر رہی ہے
مگر میرے سینے میں زندہ ہیں وہ لفظ
جن کی حرارت

تمھاری نگاہوں میں لَو دے رہی تھی

اعلیٰ انسان خاک آلودہ کرنوں کو سورجوں میں ڈھالنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ گدڑی میں لعل ہوتے ہیں اور جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کے الفاظ سماج کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ شاعر کا کردار بھی یہی ہے۔ وہ اپنی کھری باتوں سے مزرع زندگی کو ہری بنانے کا کام کرتا ہے۔

زاہد منیر عامر کی نظمیں اپنے جوہر کے اعتبار سے رہنمائی مہیا کرنے والی نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں سپاٹ بھی ہو سکتی تھیں لیکن شاعر نے جا بجا اپنے متخیلہ کی آنچ سے مس خام کو زر بنانے کا کام کیا ہے۔ اگرچہ یہ کام اقبال کی شاعری سے کافی مختلف ہے تاہم انہوں نے بھی اپنے انداز سے دلوں میں سرد ہو چکنے والی آگ کی راکھ میں اس لیے انگلیاں پھیری ہیں کہ شاید کوئی چنگاری از سر نو کوئی الاؤ جگا دے۔ انہیں تمام ایسے دن یاد ہیں کہ جن کے رنگوں میں زندگی خیز سلاسل موجود ہیں۔ یہ سلاسل عہد حاضر کے المیوں، سانحوں، بے راہ رویوں اور انسان دشمن معاملوں پر احساس کی سطح پر غور کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''نظم تم سے کلام کرتی ہے'' سے ان کے شعری جہت نمائی کا اندازہ ہو سکتا ہے:

نظم تم سے کلام کرتی ہے
آسمانوں کے نور و نکہت میں
خوشبوؤں کی حسین رنگت میں
لفظ و معنی، اٹوٹ سنگت میں
نظم کے تانے بانے بنتے ہیں
میٹھی یادوں کے پھول چنتے ہیں
نظم تم سے کلام کرتی ہے
صبح کے بے کراں اجالے میں
(روشنی کے لطیف ہالے میں)
سرو میں، ہر کلی میں، لالے میں
چار موسم جو یہ ہمارے ہیں

یہ عناصر کے استعارے ہیں
رنگ جتنے ہیں سب تمھارے ہیں
یاد......لفظوں میں رنگ بھرتی ہے
نظم تم سے کلام کرتی ہے

زاہد منیر عامر کی نظمیں جدید لسانی ساختوں سے گریز نہیں کرتیں تاہم انہیں شاعری میں فصاحت و بلاغت کے فنی حوالوں سے کسی قسم کی کوئی کد نہیں ہے۔انہوں نے اپنے سینے میں سانس لیتی کرنوں سے سیہ شبوں اور پھسلتی ریت کے ذروں کو اجالنا ہے۔

شاعری میں حسن پرستی اگر بوالہوسانہ ہو تو اسے جبلی قفس تک محدود سمجھنا لازمی ہے۔خدا کی فانی مخلوق کے ظاہری حسن کے اتار چڑھاؤ میں صرف ایک معنی پوشیدہ ہیں اور وہ یہ کہ اس کی حقیقت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔اس لیے اس جمال کی تلاش جو انسان کے ویرانہ دل میں ایک خزانے کی طرح پوشیدہ ہے اس کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔

آنکھوں میں چھپے لفظوں
ہاتھوں میں چھپے لیکھوں
سینوں میں دبے جذبوں کو کس نے یہاں سمجھا......
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں
جب وقت مہکتا ہے
ہر شاخ پہ شادابی
مستی میں لہکتی ہے
جب پیار نمو بن کر
شاخوں سے ٹپکتا ہے
اُس وقت بھی دنیا کو
اِس حسن سے ملنے کی
فرصت ہی نہیں ہوتی
ہر ایک کی دنیا کے......کچھ اپنے مسائل ہیں

سرمست شبابوں کے
اور آنکھ سے خوابوں کے
جب قافلے چلتے ہیں
سونے کی تمازت کو
چاندی سے بدلتے ہیں
سپنوں کو ٹھہرنے کی...... فرصت ہی نہیں ہوتی
وہ کون ہے جو رُک کر
جاتے ہوئے لمحوں کو...... دھیرے سے بلالائے
من روپ سجا پائے
ہر ایک کی دنیا کے...... کچھ اپنے مسائل ہیں
ساحل سے سفینوں کو
ملتا ہے اشارا جب
آنکھوں میں چھپے موتی
کرتے ہیں کنارا جب
ہر رنگ بدلتا ہے
کہنے کو تو کہتے ہیں
اے کاش نہ تم جاتے
لیکن کسے فرصت ہے......؟
رُک کر وہ ہمیں تھامے
اور کون ہے جو روکے......؟
ہر ایک کی دنیا کے...... کچھ اپنے مسائل ہیں

شاعرانہ وہم پر عمومی حقیقت کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ وہم شاعر کو ازلی رابطوں کی جانب لے جا سکتا ہے اور اسے زندگی کے عناصر کا عکس اپنے دل کے آئینوں میں دیکھنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ جزو اور کل کے دائرے وقت کے سمندر میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے

ایک دوسرے سے دور بھی اگر ہو جائیں تو بھی جادہ لالے کے داغ کا فتیلہ ہی رہے گا۔ پھول، محبوب، خوشبو سب ایک کل میں ڈھل جائیں تو کہا جائے گا شاعرانہ وہم کا جادو اثر کر گیا ہے۔ زاہد منیر عامر کی شاعرانہ اپج میں انسان و کائنات، اور وقت و مقام ایک کل میں ڈھلتے نظر اسی وجہ سے ان کی نظموں کی ظاہری معنویت سے آگے یا ماورا جانے والا کئی اور حقیقتوں اور حوالوں سے باخبر ہو سکتا ہے۔

یہ وہ تجربہ ہے، جس میں
کوئی حد نہیں مکاں کی
سرِ ساحلِ زمانہ
(جو ازل سے بہہ رہا ہے)
مرے بحرِ بے کراں کی
یہ جو رنگ روپ، چہرے
مرے ہر طرف سجے ہیں
یہ تمام آئنے ہیں
(ترا عکس آئنوں مین)
یہ جو پھول سے گزر کر
مری روح میں سمائی
یہی خوشبوئے فروزاں
مجھے جگمگا رہی ہے
وہ کلی جو کھل گئی ہے
سرِ راہ بجھ گئی ہے
دبے پاؤں اس روش پر
تری یاد آرہی ہے ....

شاعر کے خیال کی باطنی چمک اس کی تخلیقات میں اگر سرایت نہ کر سکے تو جان لینا چاہیئے

اس کی شعری مہارت میں کسر رہ گئی ہے۔زاہدمنیر عامر محبت کو آسمانی پیغام سمجھتے ہیں ۔یہ پیغام انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا کام کرتا ہے۔شاعر کا دل اگر محبت کی اس الوہیت کا مرکز بنتا ہے تو اسے ہر جا وہ محبوب نظر آتا ہے جس کی تخلیقی صلاحیتیں تا ہنوز بیدار ہیں اور وہ نت نئے مظاہر پیدا کرنے میں منہمک ہے۔اسی تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ شاعرانہ کن کا سحر شاعر کو ہمہ وقت تخلیقی حالتوں میں مبتلا رکھ سکتا ہے۔شاعر اپنے دل کی لوح پر لکھے نام کو ابر نیساں کا قطرہ بنا کر صدف کے سچے موتی میں ڈھال سکتا ہے۔اس کی پہنچ ستاروں تک ہو سکتی ہے ۔البتہ وہ نام جو ریت پر لکھا رہ جائے وہ مٹ جاتا ہے۔نقش بر آب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔شاعر کے دل کی آواز بادلوں کے وسیلے سے کشت زاروں میں فصلیں اگانے کے کام آ سکتی ہے۔وہ اپنے دل کی لوح پر لکھے نام کو نئے روپ عطا کر سکتا ہے ۔اسے لالہ و گل کی صورت زمین سے اگا سکتا ہے۔جب درختوں سے کوئلیں اڑ جاتی ہیں اور زندگی رک سی جاتی ہے تو تب شاعر آوازوں اور سناٹوں کے درمیان زندگی کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔کبھی اسے ستارے اپنے مونس دکھائی دیتے ہیں اور کبھی وہ خود ستارہ بن جاتا ہے ۔شاعر اگر ستارہ بن جائے تو وہ بھٹکے ہوئے آہوؤں کو منزل کی جانب رواں کر سکتا ہے۔ زاہدمنیر عامر کی نظم ''اَن گنت صدیوں کے پیچاک میں دمکتا ستارہ'' معنی کی نئی پرتوں کی نقیب ہے:

وہ ستارہ جو بلندی پہ مکیں تھا
میرے باطن میں کہیں تھا
وقت کی دھند میں گم اس کی چمک
آسمانوں پہ تو لَو دیتی تھی
پر زمیں والوں کی آنکھوں سے بہت دور
چھپی رہتی تھی

نور کا پارہ، ستارہ کہ زمیں
جس کی چمک کی خاطر
اَن گنت صدیوں کے دامن سے اُلجھتی ہی رہی
اس نے خود صدیوں کے پیچاک کو یوں چاک کیا

سر بلندی کی رِدا بام فلک پر رکھ کر
میرے ہونٹوں پہ اُتر آیا وہ دھیرے دھیرے
اور اک عالمِ سرشاری میں
میں نے اسے چوم لیا

علامہ اقبال نے پیام مشرق میں اپنی شاعری کے حوالے سے لکھا تھا کہ کم نظر میری جان کی بیتابی نہیں دیکھتے ۔انہوں نے میرا ظاہر تو دیکھا ہے لیکن میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔شاعر کی فطرت میں عشق ومحبت کی حرارتیں موجزن ہوتی ہیں اور وہ غیر حقیقی باتوں کے خس و خاشاک کو اپنی داخلی آگ سے جلا دیتا ہے:۔اس کے دماغ پر ملک و دین کے معالے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ نقش غیر کو اپنی آنکھوں کے پردے سے مٹا دیتا ہے:

برگ گل رنگین زمضمون من است　　　مصرع من قطرۂ خون من است
تا نہ پنداری سخن دیوانگیست　　　درکمال ایں جنوں فرزانگیست

شاعر کے مضامین اس لیے پھلوں کی پتیوں کو رنگین کرتے ہیں کہ اس کے مصرعے اس کے خون جگر سے نمو پاتے ہیں۔شاعری کو اقبال نے ایسے دیوانگی سے عبارت جانا ہے کہ جب وہ اپنے کمال یا اوج کو چھوتی ہے تو اس کے باطن کی فرزانگی سامنے آتی ہے۔یعنی شاعر کی دیوانگی میں اس کے شعور کے سورج کی کرنیں جھلملاتی رہتی ہیں۔ زاہد منیر عامر نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''گلشن حیات میں کھلنے والا ہر پھول پہلے ہی دن سے اپنا رنگ و روپ ساتھ لاتا ہے بعد میں اس کی دریافت کا عمل انجام پاتا رہتا ہے ۔ ادب سے وابستگی کا سلسلہ بھی اسی طرح سے ہے اور جہاں تک دریافت کا عمل ہے وہ تو ہنوز جاری ہے ۔ اگر آپ کے اس سوال کا تعلق بالکل ہی ظاہری سطح سے ہے تو پھر عرض ہے کہ پہلی کتاب میٹرک کے زمانہ طالب علمی میں لکھی تھی جس پر احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سید عبداللہ، نسیم حجازی، ڈاکٹر وزیر آغا جیسے بزرگوں نے مضامین لکھے جس سے حوصلہ بڑھا۔''

''حقیقت میں کوئی بھی صنف ہو جب تک انسان کے داخل میں اس کے لیے مناسبت نہیں ہو گی۔ اس کی کاوشیں رائیگاں ہی کہلائیں گی۔ داخل کی یہ مناسبت ظہور کر کے رہتی ہے "شہر میں جا کے بلا لائے گا صحرا مجھ کو" والی بات ہے ۔ میری زندگی کی شعری جہت کا آغاز تو غزل سے ہوا۔ دور طالب علمی ہی میں میری بعض غزلیں گائی بھی گئیں، مشاعروں میں بھی میرا تعارف غزل کے شاعر کے طور پر ہی ہوتا تھا۔ غزل کے علاوہ میں نے بہت سی پابند نظمیں بھی کہیں، اس زمانے میں انھیں بھی مقبولیت ملی جو میرے اوّلین شعری مجموعے میں اب بھی موجود ہیں لیکن ایک دن اچانک مجھ پر آزاد نظم منکشف ہو گئی یا آپ کے الفاظ میں آزاد نظم نے مجھے منتخب کر لیا۔ میں سرگودھا چھوڑ کر ایم اے کرنے کے لیے لاہور آ رہا تھا ......سرگودھا سے دلی وابستگی تھی لیکن تعلیم بھی مکمل کرنا تھی، مسرت اور ملال ایک ہی صف میں کھڑے تھے ۔ اداسی کی کیفیت تھی کہ بے ساختہ نظم "آخری دن" لکھی گئی۔ "آخری دن" میری جدید نظم سے وابستگی کا پہلا دن ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مجھے یوں لگا کہ میں جو کہنا چاہتا تھا اب تک تو محض اسے بیان کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔ اس کا پیرایہ بیان تو اب معلوم ہوا۔ آزاد نظم میری زندگی کا سہارا ہے، دنیا مایوس کرنے لگتی ہے تو نظم مجھے اپنی بانہوں میں لے لیتی ہے اور میری سانسیں بحال ہو جاتی ہیں۔ مجھے اپنے باطن کی یہ شمع اپنے کاموں میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

آزاد نظم سے زاہد منیر عامر کی دلچسپی نے ان کو کلاسیکی اظہار کی اصناف سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے حوالے سے لکھی جانے والی اپنی ایک نظم میں انہوں نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ شاعر سمے کا پارکھ ہوتا ہے ۔اس کی آنکھیں اس پارکھی دور رس آنکھیں ہوتی ہیں۔اس کے خوش ادا لفظوں میں فکر کے دور تک قوسیں بنانے والے دائرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کومل سروں سے زمانے کی ساعتوں کو مسحور کرتا ہے۔اس کے ارد گرد گدلے دن ہوتے ہیں ۔وہ ان کے اندر سے ایک نیا ماحول طلوع کروا سکتا ہے۔ زاہد منیر عامر کی نظم

''سمے کا پارکھ'' شاعر اور انسان کے حوالے سے اظہر من الشمس حقیقتوں کی عکاس ہے:

گزرتے وقت
اس کی مانگ میں عمر گریزاں کا
نہ کوئی رنگ بھرنا
چمکتی ،وقت کے اُس پار تکتی، دُوررَس آنکھوں کے روشن آئینے میں...... بال مت لانا
سمے کے تیز زینے پر
سہج کر پاؤں دھرتے
خوش ادا لفظوں ، لچکتے نرم جملوں
دُور تک قوسیں بناتے دائروں کو
پھیلنے دینا
زمانے کی سماعت کو
جو کومل سُر میسر ہے
اسے مت چھیننا......
گدلے دنوں کی گرد نے پانی کا دامن تھام رکھا ہے......
وہ میلے دامنوں، میلے دنوں میں جگمگاتا ہے
کنول ہے، مسکراتا ہے
گُروں کے دائرے ،اس کی نگاہوں میں
چمکتی شیشہ بازی ہیں
کوئی جادو سمے کا
یا گُروں کا ،شیشہ بازوں کا
اسے مجبور کر سکتا نہیں ہے
کہانی کا ہر اک کردار
اپنا راز اس پر کھولتا ہے
زمانے سن!

ابھی وہ بولتا ہے

ایک شاعر پر لکھی جانے والی نظم میں زاہد منیر عامر نے اپنا نظریہ شعر بھی پیش کیا ہے۔ یعنی شاعر مردم شناس ہوتا ہے اور زمانے کی کہانیوں کے سارے کرداروں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔

زاہد منیر عامر کی مردم شناسی میں ان کی جہاں بینی نے اعماق پیدا کیے ہیں۔ مختلف ملکوں کے سفروں کے حوالے سے لکھی جانے والی زاہد منیر عامر کی نظمیں ہجر و وصال، تنہائی، تحیر کے تاثرات سے معمور ہیں۔ وہ جہاں ان ممالک کے حسین منظروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہاں اپنے خوابوں، تصوروں اور شعوری زاویوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ان میں ان کو اپنی آنکھوں میں چھپے موتیوں (آنسوؤں) کا بھی تذکرہ کرنا پڑا۔ ان کی نظم چلو تصویر سے پوچھیں ان کی ان تمام کیفیات کا خلاصہ سامنے لاتی ہے جو انہوں نے غیر ممالک کے اسفار کے حوالوں سے محسوس کی تھیں۔ انہوں نے مختلف ممالک میں بسر کردہ اپنے شب و روز کو شاعرانہ تصویروں میں ڈھالا ہے۔ تصویریں حیرت کی علامات ہیں۔ وہ اپنی حیرت کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں تاہم شاعر نے اپنی لفظی تصویروں میں اپنے تجربات کی ایجازی حکائتیں سمیٹی ہیں۔ ان کی مسافتوں سے ان کی مٹھیوں میں بند خوابوں کو رنگیں حرارت عطا ہوئی۔ اس تناظر میں زاہد منیر عامر کی نظم ''چلو تصویر سے پوچھیں'' نئی تناظر کشائی کرتی دکھائی دی ہے:

تمھارے دل کی ہر تحریر میں
تصویر ہے بیتے دنوں کی
تصور کی، تخیل کی ....
تصور آسماں پر اک جہاں تخلیق کرتا ہے
تخیل رنگ بھرتا ہے
بنا آہٹ، خموشی سے
یہی تصویر، دھیرے سے
نشیلے آئنوں سے ہو کے دل میں جا اُترتی ہے

چلو تصویر سے پوچھیں ......
وہ سب سپنے، وہ سب باتیں
لبوں سے پھوٹتے جھرنے
وہ آنکھوں سے لگی رم جھم
کبھی اس پر بھی اترے تھے
گریزاں ساعتیں رقصاں ہوئیں
دل میں شرر بن کر......؟
تماشا رنگ پر تھا اور مژہ برہم نہ ہوتی تھی......
مگر تصویر تو دیوار پر ہے
اور اس کی نیم وا آنکھوں میں حیرت ہے

زاہد منیر عامر کی نظمیں سماجی دکھوں کے اظہار سے گہرے طور پر مربوط ہیں۔اس حوالے سے نمونے کے طور پر ان کی نظم ''ڈاؤن سائزنگ'' ملاحظہ ہو۔ یہ نظم گلوبلائزیشن کے خم و چم میں بے روزگاری اور بیکاری کے نوحوں کی نشاندہی کرنے والی دکھ بھری نظم ہے۔زاہد منیر عامر نے انسان کی کم مائیگی، بے حسی، بے مروتی کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔تاہم زندگی، انسان اور کائنات پر ان کی ایقانی نظر نے انہیں کہیں بھی فانی بدایونی نہیں بننے دیا۔انہوں موت اور فنا کے موضوعات کے اندر سے زندگی اور بقا کے تصورات کو ہویدا کرنے کا عمدہ کام کیا ہے۔

کانپتے ہاتھوں میں خط
آنکھوں میں رقصاں دائرے
دور ہوتا در، بچھڑتی منزلیں
اجلے کاغذ پر سیہ لفظوں کے پیچیدہ نقوش
ڈولتے قدموں سے گھر کی سمت جاتی راہ پر
ان گنت چہروں کے بے چہرہ نقوش
رحمتیں ---ہاتھوں کی پیلاہٹ کے دن

ماں ۔۔۔ دعاؤں کی سنہری ڈور باندھے منتظر
کھلکھلاتے پھول ۔۔ مستقبل سے یکسر بے خبر
اک شریکِ جبرِ زیست
ایک کاغذ سب کو اپنی آگ میں جھلسا گیا
جگمگاتے دن اندھیرے بن گئے
اشرف المخلوق اس دنیا کا بوجھ
ایک دم بے کار، بے مصرف، فضول
دور تک آنکھوں میں تاریکی کی دھول (ڈاؤن سائزنگ)

اردو شاعری میں من و تو کے رشتوں کے حوالوں سے بڑی عمدہ شاعری کی گئی ہے۔ اس شاعری کو محبت اور چاہتوں کے تناظر میں چوکھا رنگ عطا ہوا ہے۔ کئی شاعروں نے اس موضوع کی سطحیت کو ابھارا ہے۔ تاہم ایسے شاعر بھی موجود ہیں جنہوں نے من و تو کی انسانی یکتائی کی بات کرتے ہوئے'' تو من شدی من تو شدم'' والا سنجیدہ اور معاملہ فہم رویہ اپنایا ہے۔ محبت میں جسم سے ورا جانے کی کیفیات کو اگر چہ کہنے والوں نے افلاطونی محبت سے تعبیر کیا ہے تاہم زندگی کی حاجات میں سے اسے بھی ایک حاجت کے طور پر دیکھنے والے بھی اپنے دل پشوری کرتے رہتے ہیں۔ زاہد منیر عامر نے اپنی نظموں ''محبت امتحاں ہے''، ''محبت آزمائیں گے''، ''کہاں ہو تم''، ''تمہیں کیسے مناؤں''، ''محبت شکریہ تیرا''، ''محبت پھول ہے لیکن''، ''محبت سے پہلے''، ''محبت سے ذرا پہلے''، ''چراغ نفس ہے چراغ محبت'' میں اپنے شستہ اور نفیس جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یعنی ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے معنی کے پریدہ پرندوں کو اپنے لفظوں کی ڈوریوں سے باندھ رکھا ہے۔ زاہد منیر عامر کی نظم ''چراغِ نفس ہے چراغِ محبت'' فکری تمازت سے معمور ہے:

(۱)

پلٹ جائے گر وہ
پکارو نہیں تم
اسے اپنے دل سے اتارو نہیں تم

(۲)

صدا دل سے نکلے، اُتر جائے دل میں
سنا ہے یہ ہم نے!
مگر پھر یہ کیا ہے
کہ خیزد نہ ریزد

(۳)

الاؤ۔۔ جو کل تک دہکتا تھا دل میں
اسے کھا گئی سرد مہری جہاں کی
چراغ اک ابھی تک مگر جل رہا ہے

(۴)

تہِ دل میں روشن چراغِ محبت
نگاہوں پہ ہے خانماں کی تباہی
کوئی دم کا مہماں چراغِ نفس ہے
چراغِ نفَس ہے چراغِ محبت

(۵)

تصوّر، تخیّل، تاثر؛ محبت
مہکتی ہے نوخیز سبزے کی صورت
وہ بوڑھا شکاری، وہ مقراض اس کی
چمکتے ہیں سبزے پہ تلوار بن کر

ایرک فرام نے بیسویں صدی کی مادی میکانکیت کے ماحول میں رہتے ہوئے محبت کی پذیرائی کرتے ہوئے اسے عشق کے صوفیانہ حوالوں سے مملو کیا ہے۔یعنی محبّ محبوب کا مکمل نیاز مند ہو جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''بیگانگی کی کئی صورتوں میں سے عمومی صورت زبان میں بیگانگی ہے۔اگر میں لفظ میں اپنے احساس مثلاً ''میں تم سے محبت کرتا ہوں'' کا بیان کرتا

ہوں تو محبت کا لفظ اس حقیقت کا مظہر ہے جو میرے اندر موجود ہے، یعنی میری محبت کرنے کی قوت۔ محبت کا لفظ محبت کے امر کی علامت ہے۔لیکن جیسے ہی یہ بولا جاتا ہے تو یہ اپنی نوع کی زندگی کا ایسا مفروضہ ہے جو حقیقت پذیر ہوا ہے۔ مجھے یہ الوژن ہوتا ہے کہ محبت بولنے کا مطلب محبت کے تجربے کا ہم سر ہونا ہے، جونہی میں یہ لفظ بولتا ہوں تو میں اس میں اظہار پاتی محبت کے خیال سے زیادہ کچھ محسوس نہیں کرتا۔ زبان کی بیگانگی ، بیگانگی کی تمامتر پیچیدگی سامنے لاتی ہے۔زبان انسان کی انتہائی قیمتی تحصیل ہے، اس لفظ کو اگر اس لیے بولا نہیں جائے گا کہ یہ بیگانگی خیز ہے تو یہ بات حماقت پر مبنی ہو گی۔ بایں ہمہ ہمیں ہمیشہ بولے ہوئے لفظ کے خطرے سے آگاہ رہنا ہو گا کیونکہ یوں یہ اپنے آپ کو زندہ تجربے کا قائمقام بنا رہا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات انسان کی تمام تحصیلوں خیالوں، فن، اور انسان کے بنائے ہوئے کسی قسم کے معروض، کے لیے بھی سچ ہے۔یہ انسان کی تخلیقات ہیں، یہ زندگی کی قابل قدر مددگار ہیں۔لیکن ان میں سے ہر ایک ایک پھندہ بھی ہے، ایک ایسی ترغیب جو زندگی کو اشیا سے خلط ملط کرتی ہے، مصنوعات سے تجربہ کرتی ہے اور سرینڈر اور سمشن کا احساس دلاتی ہے۔''

اس سیاق وسباق میں زاہد منیر عامر کی ایک نظم ''ابھی تو بھولے نہیں تھے وہ دن'' کے تیور دیکھیے:

ابھی تو بھولے نہیں تھے وہ دن
کہ جن دنوں میں کسا ہوا تھا کسی شکنجے میں دل کا پنچھی
اور اس شکنجے کی آ ہنی سِل
پہ ضربِ کاری کا اک تسلسل
اور اس پہ آنکھوں کے موتیوں کو
شکستہ سینے کی لحہ لحہ اکھڑتی سانسوں ،
جبیں کی ٹوٹی ٹپکتی شکنوں کو

مسکراہٹ میں ڈھالنا تھا

اندھیری شب کو اجالنا تھا
ابھی تو بھولے نہیں تھے وہ دن۔۔۔۔۔
نئے دنوں میں انھی دنوں کا سا ذائقہ ہے
اداس راتیں ہیں، رت جگا ہے
چمکتی صبحوں کے زندہ رنگوں میں
جو سلاسل چھپے ہوئے ہیں
نئے نہیں ہیں۔۔۔
ابھی تو بھولے نہیں تھے وہ دن

ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے محبت امتحاں ہے:

زرا دیکھو گزرتے روز و شب کو
ہر اک لمحہ ستارہ ہے
اگر تسخیر ہو جائے تو ہر لمحہ تمھارا ہے
تمھارے خوب صورت ہاتھ میں کتنے ستارے ہیں
انھیں تسخیر کرلو تو تمھاری مانگ میں یہ سب ستارے جگمگائیں گے
ستارے اور آئیں گے
فلک بھی اور آئیں گے
اگر تم روشنی سے دوستی کرلو
تو یہ جانو کہ ہر لمحہ محبت کا نشاں ہے
محبت امتحاں ہے

ن ۔ راشد نے ماورا سے لے کر گماں کا ممکن تک محبت کے موضوع کو رنگا رنگ جہتوں کی عکاسی کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ محبت کو شعلہ پراں قرار دیتے ہیں اور ہوس کو ''بوئے گل بے بو'' سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دہر کے اس راز پر زیادہ گفتگو نہ کرو۔ حسن کوزہ گر کی بیوی

چیکتی ہے کہ اسے محبت کے مارے محبت تو امیروں کا کھیل ہے۔ انہیں جس آگ سے محبت کا خمیر اٹھتا دکھائی دیتا ہے اس کے شرر بھی گم نظر آتے ہیں۔ محبت کی کلی جزوی منطق بھی ان کے سامنے ہے کہ جہاں محبّ اور محبوب ایک وجود کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محبت کے جذبوں سے بیگانہ مخلوق مثلاً اہل مریخ نہ تو ژولیدہ باہوں کے رنگ دیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی وہ ''محبت میں سرخوش نگاہوں کے رنگ؟'' کہ جو کہیں ہوس کی وجہ سے گناہوں کے رنگ بن جاتے ہیں ان کا مشاہدہ کر پاتے ہیں۔ کہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان جب ریاضی اور ادب کو بھول کر سیم وزر کی آرزوؤں کے ریلوں میں بہنے لگتا ہے تو وہ سمندری امواج میں اپنا رستہ گم کر لیتا ہے۔ لیکن راشد صاحب کا سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا ان کے یقینوں، عملوں اور محبتوں کا یہی حاصل تھا؟ زاہد منیر عامر نے محبت کے موضوع کو خوش اسلوبی سے اپنے نظمیہ بیانیوں میں جگہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ محبت آزمائیں گے لیکن اس کا تناظر فطرت اور کائنات ہوگا۔ اس لیے وہ زمینی آسمانی پیغاموں میں موجود پیار کے کوائف کا رستہ کشادہ رکھیں گے۔ اور ''شاخچوں پر کوکتی کوئل کے نغموں کو سننے کے ساتھ ساتھ پرندوں کی پھول دوست کی راہ کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ انسانوں کی آسوں اور امیدوں کی قدر کریں گے۔ محبت اور عشق کی لگن کے وسیلے سے چاند کی منزلوں کے راہی ہوں گے۔ انسان کی محبت کی یہی آزمائش ہے۔ محبوب اور محبّ ان کے نزدیک یکجان ہو کر دنیا کے مزاج کو تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

محبت میں بیگانگی کی ہر صورت ملاوٹ آمیز لگتی ہے اس میں غیر پاکیزہ خیالوں کی مداخلت اسے گناہ آلود کر سکتی ہے۔ زاہد منیر عامر کے محبت کے حوالے تجرباتی حقیقت کے مظہر ہیں۔ ان کے اندر موجود محبت کرنے کی قوت انہیں فطرت، انسان اور سماج سے ہمکلام کرتی ہے۔ یوں یہ تجربے نجی نہیں رہتے اجتماعی سلسلوں سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے محبت کا لفظ محبت کے امر کی علامت بنا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

ممتاز پروفیسر جی سی یونی ورسٹی لاہور

مصنف کی بعض دوسری کتابیں

۱۔ مکاتیب ظفر علی خان	۱۹۸۶ء
۲۔ لمحوں کا قرض	۱۹۸۹ء
۳۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر	۱۹۸۹ء
۴۔ اقبال شناسی اور نوید صبح	۱۹۹۰ء
۵۔ نقوش جاوداں	۱۹۸۸ء
۶۔ حالات و مکتوبات مولانا تاج محمود	۱۹۸۵ء
۷۔ ظفر علی خان- کتابیات	۱۹۹۳ء
۸۔ علامہ اقبالؒ کی تاریخ ولادت- ایک مطالعہ (بہ اشتراک)	۱۹۹۴ء
۹۔ میر سوز- سوانح اور شخصیت	۲۰۰۰ء
۱۰۔ پہلی سحر کے رنگ (شعری مجموعہ)	۱۹۸۹ء
۱۱۔ ترا عکس آئنوں میں (شعری مجموعہ)	۲۰۰۰ء
۱۲۔ لمحے کی روشنی	۲۰۰۱ء
۱۳۔ ارمغانِ شیرانی (بہ اشتراک)	۲۰۰۲ء
۱۴۔ آئینۂ کردار	۲۰۰۳ء
۱۵۔ تاریخ جامعہ پنجاب	۲۰۰۴ء
۱۶۔ چار موسم ایچی سن کالج میں	۲۰۰۴ء
۱۷۔ جہات (تحقیقی مقالات)	۲۰۰۰ء
۱۸۔ چلچراغ (تحقیقی مقالات)	۲۰۰۷ء
۱۹۔ نظم مجھ سے کلام کرتی ہے (شعری مجموعہ)	۲۰۰۷ء
۲۰۔ کلیاتِ میر سوز جلد اول	۲۰۰۷ء
۲۱۔ شام کی صبح لبنان کی شام (سفرنامہ)	۲۰۰۹ء

۲۲۔	ستارۂ سحر	۲۰۰۹ء
۲۳۔	On the wings of poesy	2007
۲۴۔	O'er the deep	2008
۲۵۔	O' Arab World	2010
۲۶۔	بدایات و نہایات (عربی)	۲۰۱۰ء
۲۷۔	ظفر علی خان ..... خطوط و خیوط	۲۰۱۲ء
۲۸۔	روشناس (تنقیدی مقالات)	۲۰۱۲ء
۲۹۔	جزیرے کا خواب (ماریشس کا سفرنامہ)	۲۰۱۲ء
۳۰۔	کلیاتِ میر سوز (جلد دوم)	۲۰۱۵ء
۳۱۔	ارمغان خورشید	۲۰۱۵ء
۳۲۔	اقبال کا جہان نو	۲۰۱۶ء
۳۳۔	*Religious Tolerance in Muhammad Iqbal's Philosophy*	۲۰۱۶ء
۳۴۔	جنت کا باغ	۲۰۱۷ء
۳۵۔	*Humanity Beyond Creed*	۲۰۱۸ء
۳۶	*SocioPolitical Features of Educational Landscape in Pakistan*	۲۰۱۸ء
۳۷۔	فی حب مصر (عربی)	۲۰۱۹ء
۳۸۔	دیارِ شمس (ترکی نامہ)	۲۰۱۹ء
۳۹۔	ارمغان جمیل جالبی	۲۰۲۰ء
۴۰۔	اقبال امروز و فردا	۲۰۲۰ء
۴۱۔	طلب کے لمحے (مشاہیر کا دور طالب علمی)	۲۰۲۰ء
۴۲۔	سقراط کا دیس (سفرنامہ یونان)	۲۰۲۱ء
۴۳۔	دو کوزہ گر (شبلی نعمانی اور ظفر علی خان)	۲۰۲۱ء
۴۴۔	مراۃ السلوک (عربی)	زیرِ طبع

نام ور محقق، ممتاز ادیب، صاحبِ اسلوب نثر نگار اور عالمی سطح کے مشہور و معروف اسکالر پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا شعری مجموعہ ''آتے دنوں میں گم'' کے عنوان سے جہان علم و ادب سے تعلق رکھنے والے خواتین و حضرات کے لیے ایک خوش کن خبر ہے۔ صاحبِ دل تخلیق کار کی جانب سے یہ نظمیہ پیش کش کچھ رومانوی، جذباتی اور محبت کی واردات کے بیان کی نظمیں ہیں اور کچھ دل کے قریب رشتوں اور جذبوں کی دلآویز یادوں کا احوال بھی۔

اردو ادب کی تاریخ میں بعض نام ور محققوں، نقادوں اور اساتذہ نے شاعری کے میدان میں بھی اپنی تخلیقی توانائی کا اظہار کیا ہے مگر بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے تنقید و تحقیق کی طرح شعر میں بھی کوئی نمایاں مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ ان کا تذکرہ محض اس حوالے سے تذکرے میں آ جاتا ہے کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ زاہد منیر عامر کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مشرق کی کلاسیکی تخلیقی روایت سے آگاہی اور زبان و بیان کے تمام رنگ و آہنگ نمایاں کرنے کا ہنر انھیں بخوبی آتا ہے۔ ان کی نعت، ان کے مضامین اور ان کی فکر باہم آمیز ہو کر ایک خوش گوار تاثر کو جنم دیتے ہیں جو اپنی تہ داری اور جمالیاتی تنوع کے سبب ہمیں اپنی جانب متوجہ کیے رکھتا ہے۔ زاہد منیر عامر کی نظمیں ہماری عصری شاعری کے منظر نامے میں اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کریں گی، مجھے اس کا یقین ہے۔

افتخار عارف

قلم فائونڈیشن
: بنک شاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ
qalamfoundation3@gmail.com
0300-0515101,0323-4393422

9789697470617
Rs. 450